لہٗ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ **الحق** اکوڑہ خٹک

اس شمارے میں

مدیر
سمیع الحق

جلد : ۳
شمارہ : ۶

ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ — مارچ ۱۹۶۸ء

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا

زرِ سالانہ چھ روپے - فی پرچہ ۵۰ پیسے - غیر ممالک سالانہ ایک پونڈ - مشرقی پاکستان بذریعہ ہوائی ڈاک آٹھ روپے سالانہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغاز

پچھلے ہفتہ راولپنڈی میں ادارۂ تحقیقات اسلامیہ کے زیرِ اہتمام ایک بین الاقوامی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی جسکی بعض تقریبات دیکھنے کا راقم کو بھی اتفاق ہوا۔ مختلف اسلامی ممالک کے علماء اور دانشوروں کے علاوہ پاکستان کے دو چار علماء حق کو بھی اس میں شرکت کا موقعہ دیا گیا تھا۔ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں کے علماء اور قدیم و جدید طبقات کا باہمی تبادلہ خیال اور عالمِ اسلام کو درپیش مسائل پر غور و بحث مسلمانوں کے باہمی اتحاد اور اتفاق کی ضرورت کا احساس، ایسے امور ہیں جن کے لحاظ سے اس کانفرنس کا اہتمام قابلِ تحسین قرار پاتا ہے۔ مگر تصویر کا دوسرا رُخ وہ ہے جسے ادارۂ تحقیقات اور اس کے کارپردازوں کی ذہنی ساخت نظریات اور تحقیقی "شاہکاروں" کے پس منظر میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ افتتاحی اجلاس میں منتظمین نے اس کانفرنس کے انعقاد سے اپنی جن توقعات کے وابستہ ہونیکا اظہار کیا اس سے بھی یہ حقیقت ایک بار پھر کھل کر سامنے آگئی جس کا اظہار دین کو نئے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنے اور حالات کے مطابق بنانے وغیرہ الفاظ سے بار بار کیا جا رہا ہے۔

اس وقت تقریباً تمام مسلمان ممالک ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہیں جن کو ہم اسلامی افکار و اقدار اور مغربی تہذیب و اقدار کے معرکہ کا نام دے سکتے ہیں جو طبقہ تجدّد اور مغربی افکار کا حامل ہے۔ اگر اس کی اس تمام غوغہ آرائی اور کاوش کا مقصد صرف یہ ہوتا کہ مغربی تہذیب کی اخلاقی اور روحانی خرابیوں سے پہلو بچاتے ہوئے قرآن و سنت اور اسلامی اقدار کو مضبوطی سے تھام کر موجودہ عصری علوم، اور سائینسی ترقیات سے استفادہ کیا جائے اور عصرِ حاضر کے درپیش مسائل کی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں شرعی حیثیت واضح کی جاتے۔ اگر وہ مسائل اور نظریات اسلام کی اساس سے متصادم نہ ہوں انہیں اپنا لیا جائے اور نئی تہذیب کی جو باتیں شریعتِ اسلامیہ سے میل نہ کھائیں انہیں بلا تامل یکسر خیر باد کہہ دیا جائے تو اس مقصد کی خوبی میں کسی عالم اور کسی متصلب مسلمان کی دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ اسلام نے ہر دور اور ہر زمانہ کی اچھی باتوں کو اپنانے کا تمام مذاہب سے زیادہ اہتمام کیا ہے۔ وہ انسان کو اللہ کا خلیفہ اور بر و بحر کا مالک قرار دیتا ہے۔ اس نے انسان کو کائینات اور عناصر کی تمام جوہری قوتوں کی تسخیر کی دولت سے نوازا ہے۔ اسلام جائز حدود کے اندر انسان کی ضروریات کی تکمیل اور قومی ملکی اور ملی مفادات کی حفاظت و دفاع کیلئے ترقیات زمانہ سے استفادہ اور حصولِ علوم و فنون

کیلئے دوسری اقوام کے شانہ بشانہ چلنے سے ہرگز نہیں روکتا۔ جو طبقہ اسلامی علوم و فنون اور اسلامی اقدار کا علمبردار ہے۔ اس کی طرف سے بارہا یہ چیلنج دیا جاچکا ہے۔ کہ اسلام کے کسی اصول اور نظریہ یا علماء حق کے کسی گروہ کی تعلیمات میں عصری اور تجرباتی علوم میں ترقی اور اضافہ سے منع کرنے کی کوئی مثال اگر موجود ہو تو اسے پیش کر دیا جائے۔

الغرض تجدد و اصلاح مذہب کے نعرے بلند کرنے والوں کے عزائم اور مقاصد اگر صرف یہی ہوتے تو اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہوتی مگر اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کو نئے تقاضوں کے سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں، ان کی ذہنی ساخت تعلیم و تربیت، ذاتی و سیاسی مصالح مغربی تہذیب و تمدن میں سرتاپا استغراق اور جن سرچشموں سے ان کے نظریات کی آبیاری ہو رہی ہے۔ اور اسلام پر تحقیق اور ریسرچ کے جو نت نئے نمونے مسلمانوں کے سامنے آرہے ہیں۔ ان سب چیزوں سے یہ حقیقت مسلمہ کھل کر سامنے آچکی ہے کہ دراصل ان لوگوں کا مقصد پورے اسلامی معاشرہ کو مغربی تہذیب و تمدن اور لادینی افکار و خیالات میں ڈھالنا اور اسلامی ممالک کو مغربی ممالک کے نقش قدم پر چلانا ہے۔ اس راہ میں جو بھی دینی تصورات اور ضوابط، قوانین اور دینی اقدار و روایات حائل ہو سکتے ہوں ان میں ترمیم و تنسیخ کی جائے یا اسے کھینچ تان کر اسلام کے دائرہ میں لایا جائے اور مختصراً یہ کہ اسطرح اسلام حقیقی خدوخال سے محروم ہو کر ملک و معاشرہ کو "مغربیت" کے سانچہ میں ڈھالنے کیلئے رکاوٹ نہ بنے۔ یہی وہ المناک صورتحال ہے جس سے "تجدد اور اصلاح" کے خوشنما نام سے اسلام اور راسخ العقیدہ مسلمان دوچار ہیں۔ تجدید کے نام پر مغربی تہذیب و افکار کی یہی وہ اندھی تقلید ہے جس کا رونا علامہ اقبالؒ رو چکے ہیں ؂

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید　　　مشرق میں ہے تقلید فرنگی کا بہانہ

اور یہی وہ تشویشناک صورتحال ہے جس نے دینی اقدار و افکار پر مرمٹنے والے علماء اور غیور مسلمانوں کو شدید اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ کسی حال میں بھی اسلام کو یورپ کی اخلاقی اور روحانی اقدار سے عاری نظام کی بھینٹ چڑھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ اور اس راہ میں وہ بے خطر ہر میدان میں سنگ گراں ثابت ہو جاتے ہیں جس کا کچھ مظاہرہ راولپنڈی کی کانفرنس میں لادینی نظریات پیش ہونے پر حاضرین کے سواد اعظم کا شدید نفرت اور بیزاری ظاہر کرنے کی شکل میں ہوا۔

ہ تجدد اور مغرب زدہ طبقہ کے ہاں نئے تقاضوں اور حالات کا سامنا کرنے اور مذہب کے

ترقی پذیر ہونے کا مطلب کھلے الفاظ میں یہ ہے کہ مذہب کو حالات کا تابع بنایا جائے نہ کہ حالات اور زمانہ کو مذہب کے مطابق بنایا جائے۔ جہاں تک عہد جدید کا تعلق ہے ہم حیران ہیں کہ آخر وہ کون سے تقاضے ہیں جن کا مذہب کو سامنا کرنا پڑا ہے، اور اسلام اپنی موجودہ شکل میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتا ــــ اگر انسان پیدل چلنے اور بیل گاڑی کی بجائے جیٹ سیارہ اور خلائی جہازوں میں اڑنے لگا، ہاتھ کا پنکھا چلانے کی بجائے ایر کنڈیشنر استعمال کرنے لگا، دستکاری کی جگہ بھاری بھرکم مشینوں اور کارخانوں نے سنبھال لی، وہ دال روٹی کی بجائے کیک، ٹوسٹ اور سینڈوچ کھانے لگا، برف اور ٹھنڈے پانی کی بجائے کولر، کولڈ سٹوریج اور ریفریجریٹر کے مشروبات استعمال ہونے لگے، کچے مکانات کی بجائے فلک بوس عمارتوں میں رہائش ہونے لگی، لوگ سیڑھیوں کی بجائے لفٹ سے چڑھنے لگے۔ انسان تیر وسنان کی بجائے توپ وتفنگ اور بندوق و ریوالور کی بجائے ایٹم اور میزائل پر قادر ہوا، تو آخر مذہب کا وہ کونسا اصول ہے جو ان تبدیلیوں اور تغیرات سے جوڑ نہیں کھاتا ـ؟ بیشک کھانے پینے رہنے سہنے اور مال وجان کی حفاظت کی شکل میں انسان کی جو بنیادی ضروریات تھیں عصر حاضر نے ترقی یافتہ شکل میں انہیں پورا کر دیا جو استداد زمانہ کا طبعی نتیجہ تھا ــ مذہب نے پہلے بھی چند ضابطوں اور تقاضوں سے مشروط کر کے ان ضروریات کی تحصیل و تکمیل کی اجازت دی اور آج بھی مذہب مسلمانوں کو ان تقاضوں کے اندر رکھ کر ان مادی ضروریات کے حصول اور استفادہ کی پوری اجازت دیتا ہے۔ ہاں اگر نئے تقاضوں اور عصری ضروریات سے صرف سائنسی ترقیات اور تجرباتی علوم وفنون مراد نہیں بلکہ پوری وہ تہذیب ہے، جس میں آج یورپ مبتلا ہے۔ اور جو ایک زہریلے سرطان اور مہلک جذام کی شکل میں پوری انسانیت کا جسم کھائے جا رہی ہے۔ اور آپ اسلام کا جوڑ اس مغربی طرز معاشرت سے لگانا چاہتے ہیں جس کا مطلب جنسی بے راہ روی، اخلاقی انارکی، مرد اور عورت کا آزادانہ میل ملاپ کلبوں کی زندگی، کاک ٹیل پارٹیاں، سود، شراب، جوا، نمائش حسن، سول میرج، گرل اور بوائے فرینڈز، الغرض تمام اخلاقی اور دینی حدود و اصول سے بغاوت ہے۔ تو یقین جانیئے کہ اسلام اس بارہ میں قطعی جامد اور متعصب ہے۔ اس میں ہرگز عصر حاضر کے ان قبیح تقاضوں کے ساتھ چلنے کی سکت نہیں اور وہ ایک پل کیلئے ایسے "ترقی یافتہ" اور مہذب لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسلام کا یہ جمود اور تعصب خود تجدد پسندوں پر ثابت ہو چکا ہے۔ اس لئے اسلام کو اپنی خواہشات کے تابع بنانے اور اس کا صرف لیبل اپنے ساتھ ہر حال میں چپکائے رکھنے کی بجائے جرأت مندانہ بات تو یہ ہے کہ اسے خیرباد کہہ دیجئے۔ آپ بیشک ان نئے

تقاضوں کو اپنایئے مگر اسلام بیچارے کو مشق ستم نہ بنایئے۔ یہ خدا کی آخری نعمت ہے، رہتی دنیا تک انسانیت کے حقیقی فلاح و بہبود کا اسی نسخہ شفاء پر انحصار ہے۔ اگر عصر حاضر کی فطرت مسخ ہو چکی ہے اور اس کا مزاج اسلام سے جوڑ نہیں کھاتا تو آنے والی نسلوں کو اس نسخہ ہدایت سے کیوں محروم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اپنی نفس پرستی، شکم پروری، خواہشات کی پرستش کے لئے اتنی بڑی نعمت کے ساتھ یہ تلاعب اور استہزاء اور یہ تعصب و عناد ایک ایسی بدترین ناشکری ہوگی جس کی نظیر انسانی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی——

اگر آپ دل سے چاہتے ہیں کہ اسلام کی فوقیت ہر زمانہ پر رہے اور آپ کا واقعی عقیدہ ہے کہ قرآن اور اسلام میں ہر زمانہ کے حوادث و نوازل کا حل موجود ہے۔ اور مغربی تہذیب نے جو ناجائز معاشرتی اور معاشی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، اسلام ان سب کا بہترین متبادل حل پیش کر سکتا ہے۔ تو آپ کی تحقیق اور ریسرچ کا ہدف یہ نہ ہونا چاہئے کہ یورپ کے حرام طور طریقوں کو جائز ثابت کرانے کیلئے اسلام کے محرمات کو حلال قرار دیں بلکہ اپنی تحقیق کا محور یہ بنایئے کہ یورپ کی ان غلط اور حرام چیزوں کی بجائے کن جائز اور حلال صورتوں سے نئے زمانہ کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے—— بینکنگ نظام اور سود پر ہزار بحث کیجئے مگر اس کو حلال ثابت کرانے کیلئے نہیں بلکہ اس کے متبادل حلال صورتوں مضاربت و مشارکت وغیرہ کو زیر بحث لایئے اور انہیں آزمایئے۔ شراب، بے پردگی، اور مخلوط معاشرت کو کھینچ تان کر اسلام میں داخل کرانے کی بجائے معاشرہ کو عصری ترقیات سے ہمکنار کرتے ہوئے ان خرابیوں سے بچنے کی تدبیر سوچئے۔ معاشرتی حقوق کو پامالی حق تلفی اور ظلم و تعدی سے بچانے کیلئے اسلامی معاشرہ برپا کرنے اور ظلم کے اسباب کے تدارک پر غور کریں نہ کہ آپ تعدد ازدواج پر پابندی لگائیں یا دیگر معاشرتی مسائل طلاق عدت وغیرہ میں توڑ موڑ شروع کر دیں۔ معاشی تفاوت، غیر منصفانہ تقسیم دولت اور طبقاتی کشمکش ختم کرنے کیلئے آپ اسلام کے نظام اقتصاد و اعتدال کو سامنے لاکر آزمائیں۔ نہ کہ اسلام کا رشتہ اور جوڑ، سوشلزم، مارکسزم یا سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑیں۔ نئے حوادث اور مسائل کی قرآن و سنت اور آثار صحابہ اور فقہی سلف کی روشنی میں مخصوص شرائط اور حدود میں رہتے ہوئے حل نکالیئے نہ کہ آپ عقل کو شریعت پر ترجیح دیکر عقل کے کردار کو کھلا چھوڑ دیں کہ وہ پوری شریعت اور منصوصات شریعت کو بھی "ویٹو" کر سکے عقل کو شریعت کے دائرہ میں رہنے کا ذریعہ بنایئے نہ کہ شریعت سے فرار کا—— آپ سائنس اور ٹکنالوجی میں بیشک ترقی کریں، مادی آسائش کی راہیں تلاش کریں

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہو کہ دیگر مادی اقوام کی طرح ان چیزوں کو ہی علم و حکمت سمجھ بیٹھیں۔ تسخیر کائنات بالفاظ شکم پروری کی تدبیروں" کو ہی قرآنی تعلیمات کا خلاصہ پیغمبر کی تعلیمات کا نچوڑ تخلیق انسانی کا مقصد اور قرآن کے دعوت و تفکر و تدبر کا محور سمجھ بیٹھیں، اور تعلیمات قرآنی کے حقیقی مقصد عبدیت خداوندی حصول و مرضیات الہٰی اور فلاح آخرت کو ثانوی حیثیت دیدیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ اسلام کو محض ایک مادی نظام اور شکم پرور مذہب کی شکل دینا چاہتے ہیں جس کا مقصد سرمایہ داری یا کمیونزم کی طرح صرف جسم اور پیٹ کی پرورش رہ جاتے اور تمام اخلاقی اور روحانی قدریں پامال ہو جائیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسطرح آپ مذہب کا نام بھی لے سکیں گے اور اس کے تمام مطالبات سے بھی بچ جائیں گے۔ مذاہب عالم کی تاریخ میں مذہب کیساتھ اس عیاری تمسخر اور استہزاء کی مثال بمشکل مل سکے گی۔

ہم نے مذہب کے تجدد و اصلاح کی ان کوششوں کے بارہ میں جن خدشات کا اظہار کیا اہل تجدد یقیناً اسے سوء ظن ہماری تنگ نظری اور رجعت پسندی قرار دیں گے۔ جیساکہ ان الزامات کو پچھلے دنوں ادارہ تحقیقات اور اس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمن کے تعارف پر مشتمل بعض اخباری مضامین میں بار بار دہرایا گیا ۔۔۔ ادارہ تحقیقات اور اس کے فاضل ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا وجود اس ملک میں تحریک تجدد اور مغربیت کا سب سے واضح نشان ہے۔ اس لئے ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے "تحقیقی شاہکار" بطور نمونہ اپنے قارئین کے سامنے رکھ کر فیصلہ انہی پر چھوڑتے ہیں کہ ہم ان خدشات اور بے چینی و اضطراب میں کہاں تک حق بجانب ہیں اور نئے تقاضوں کے سانچہ میں ڈھال کر کون سا اسلام تصنیف کیا جارہا ہے۔ یہ تمام "جواہر پارے" ادارہ تحقیقات کے ترجمان مجلہ فکر و نظر میں ان کے مضامین، یا پھر ان کی تازہ ترین تصنیف "اسلام" (مطبوعہ ویڈنفیلڈ اینڈ نکلسن لندن ۱۹۶۶) سے ماخوذ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ :-

۱۔ قرآن کریم کے احکام ابدی نہیں بلکہ اس کے علل اور مقاصد ابدی ہیں۔ (یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ بجائے خود لازمی نہیں، بلکہ ان کے مقاصد ابدی ہیں خواہ وہ جس شکل میں بھی ظاہر ہوں) اب تک اس تحقیق کی دو مثالیں بھی سامنے آچکی ہیں۔ آگے نماز روزہ حج میں بھی اسی اصول سے ترمیم و تبدیلی کی راہ کھلی ہے۔

الف ۔۔۔ زکوٰۃ عبادت نہیں ٹیکس ہے۔ اور اگر مروجہ نصاب سے مقصد حاصل نہ ہو سکے تو حکومت اس میں کمی بیشی کر سکتی ہے۔

ب۔ــــ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر تھی۔ اس وقت عورتیں تعلیم یافتہ ہیں اور ایک عورت کی شہادت بھی مرد کے برابر ہے۔

۲ــــ شریعت اسلامیہ غیر متبدل ہمہ گیر اور ابدی نہیں۔

۳ــــ وہی وحی مقبول ہے جو عقل و بصیرت کے معیار پر پوری اترے۔

۴ــــ وحی الٰہی اور رسول دونوں حالات اور زمانہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۵ــــ قرآن کریم کے فیصلے اور حضور کی احادیث قطعی قوانین نہیں زیادہ سے زیادہ ایک اسوہ، نمونہ اور مثال ہیں۔

۶ــــ قرآن و سنت کے اکثر احکام خاص حالات سے وابستہ تھے۔ اور وقتی اور ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں۔

۷ــــ اجتہاد کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے اور قرآنی احکام بھی اجتہاد کے زیر اثر ہیں جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔

۸ــــ وحی ایک واردات قلبی اور نبی کے شعور کی آواز ہے۔

۹ــــ جبرئیل علیہ السلام کا کوئی خارجی وجود نہ تھا یہ سب خیالات دوسری تیسری صدی کی پیداوار ہیں۔

۱۰ــــ حضورؐ کی حیثیت صرف ایک اخلاقی مصلح کی تھی۔

۱۱ــــ پیغمبر ایک عرب قوم کی تشکیل میں مصروف رہے اور قوانین بنانے کیلئے انہیں فرصت نہ مل سکی۔

۱۲ــــ معراج ایک افسانہ ہے جو زمانہ مابعد میں تراشہ اور عقیدہ رفع مسیح سے مستعار لیا گیا۔

۱۳ــــ قرآنی قصص محض بے بنیاد کہانیاں ہیں۔

۱۴ــــ حدیث کا بیشتر ذخیرہ خود ساختہ اور موضوعی ہے۔

۱۵ــــ اسلامی قانون میں حدیث کو حجت نہیں بنایا جا سکتا۔

۱۶ــــ حضورؐ نے پنجگانہ نمازوں اور ان کے احکام کی کوئی واضح تعلیم نہیں دی۔ پنجوقتہ نماز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ تک رائج نہ تھی، اور بعد کی اختراع ہے۔

۱۷ــــ سنت نبوی کا اکثر حصہ قبل از اسلام کی رسومات پر مشتمل ہے۔ اور فقہاء نے روم، ایران اور یہود کی روایات لیکر سنت میں داخل کر دی ہیں ــــ

(ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سنت ان تمام فقہی قوانین سے عبارت ہے جو ان کے زعم میں مذکورہ اقوام اور ان کے قوانین سے مستعار ہیں۔)

۱۸۔۔۔ عہدِ جاہلیت میں جو سود رائج تھا وہ حرام ہے۔ مطلق سود حرام نہیں۔

۱۹۔۔۔ صرف انگور سے تیار کی گئی شراب حرام ہے۔ اس کے علاوہ بیئر وغیرہ تمام اقسام حلال ہیں۔

۲۰۔۔۔ نزولِ عیسیٰ کا عقیدہ عیسائیوں سے مستعار ہے۔

۲۱۔۔۔ یہی حال شفاعت اور خروجِ مہدی کے عقیدہ کا ہے۔

۲۲۔۔۔ اسلام کا خلا مغرب کی رہنمائی ہی سے پر ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نظریات کے یہ چند نمونے ہیں جن کا تانا بانا مستشرقینِ یورپ کی تحقیقات سے تیار ہوتا ہے۔ اور پھر وہ مسلمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہ ہے وہ اسلام جس کا ہیولیٰ سرسید احمد خان کے نیچریت، سید امیر علی اور طہٰ حسین کے اظہارِ معذرت جوزف شاخت اور گولڈ تسیہر کی تشکیک و تلبیس اور ولفریڈ اسمتھ (یہودی) کے نقشے کے مطابق اسلام کی منصوبہ بندی جیسے عناصر سے تشکیل پا کر مسلمانوں کے سامنے تجدد و اصلاح کے دعووں کے ساتھ پیش ہو رہا ہے اور اگر اہلِ حق علماء کی طرف سے کوئی آواز اٹھتی ہے۔ تو وہ تنگ نظر، انتشار پسند، متعصب اور گردن زدنی قرار پاتے ہیں ۔۔۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون نیا للاسلام ولغیبۃ المسلمین اللھم انا نسئلک الثبات والاستقامۃ والتوفیق والسداد والعافیۃ۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

سمیع الحق

۲۱ ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ

قرآن شریف ایک مکمل نظامِ حیات ہے اس کو نازل ہوئے چودہ سو سال کا طویل عرصہ گذر چکا ہے مگر قرآن کی بات اپنی جگہ اٹل ہے۔ قرآنِ حکیم کسی مخصوص علم و فن کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں حیاتِ انسانی سے متعلق کامل ہدایات موجود ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر انفرادی و اجتماعی امن و سلامتی آزادی و خوشحالی بحال کی جا سکتی ہے۔ قرآنِ حکیم انسان کے بیشمار سوالات کا مکمل جواب رکھتا ہے

ضبط و ترتیب : ادارۃ الحق

عشق کا آخری مرحلہ قربانی

خطبۂ جمعۃ المبارک ۱۰ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) وان لیس للانسان الا ما سعٰی وان سعیہ سوف یریٰ۔

محترم بزرگو! خداوند کریم کی وہ لاانتہاء نعمتیں اور احسانات جو کل عالم اور پھر خصوصاً انسان پر ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ ہم اللہ کے عاشق بنیں۔ اس سے ہمیں محبت ہو جاتے۔ اور اللہ کے فرمانبردار بن جائیں اسکی فرمانبرداری اور تابعداری پر صرف مسلمان اور انسان ہی نہیں بلکہ خدا کی ساری مخلوق اس کا شکر ادا کرتی ہے۔ وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں کہ عالم میں ایسی کوئی چیز نہیں جو خدا کی تسبیح نہ کرے۔ مگر ان کی تسبیح انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ پہاڑ پتھر سمندر دریا اور یہ نباتات حیوانات چوپائے اور جمادات یہ آسمان و زمین چاند اور سورج سب خدا کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اس لئے کہ سب کو خدا نے نعمت وجود سے نوازا ہے۔ اور تمام چیزوں میں اپنی حیثیت کے مطابق حیات اور زندگی موجود ہے۔ کل قد علم صلوٰتہ وتسبیحہ۔ ہر ایک کو اپنی نماز اور خدا کی تسبیح کرنے کا طریقہ معلوم ہے۔ جب ان چیزوں میں علم ہو تو حیات ضرور ہوگی۔ اور تمام چیزوں کی تابعداری دیکھئے۔ خدا کا حکم ہے کہ یہ دیوار یہاں کھڑی رہے اور اس پر چھت کا بوجھ قائم رہے۔ یہ خدا کی مرضی ہے، تو یہ بھاگ نہیں سکتی۔ اسکی خلاف ورزی نہیں کرتی یعنی اللہ تعالیٰ کی تابعدار ہے۔ کبھی پانی نے یہ نہیں کہا کہ انسان کا میرے اوپر کیا حق ہے کہ مجھے پیتا رہے۔ اور مجھ سے کھیت سیراب کرتا رہے۔ اسی طرح حیوانات نے بھی بوجھ لادنے ہل جوتنے دودھ دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ہر چیز کی پیدائش سے کوئی مقصد و حکمت خدا نے وابستہ کی ہے۔ اور وہ اس میں پوری فرمانبردار ہے۔ ذرہ برابر اس میں حکم عدولی نہیں ہوتی ــــ تو قرآن کریم سے معلوم ہوا کہ کل قد علم صلوٰتہٗ

اور علم بغیر زندگی کے ہوتا نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ اگر علم ہے تو زندگی بھی ہے۔ مگر زندگیوں میں فرق اور تفاوت ہے۔ ہمارا جسم ایک ہے مگر اس کے اجزاء کی حس میں فرق ہے۔ مثلاً انگلی کے سر میں قوت احساس باقی سارے بدن کی نسبت زیادہ ہے۔ سر سے پیر تک ہمارے اعضاء کی زندگی ایک طرح کی نہیں بلکہ متفاوت ہے۔ اسی طرح زمین بھی زندہ ہے۔ گھاس پھوس پانی آسمان اور اس کے تارے بھی زندگی رکھتے ہیں، اور اس زندگی کے بموجب خدا کے حکم کی تابعداری ان میں موجود ہے۔

عناصر کی زندگی کی دلیل | جب نمرود نے ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دیا تو خداوند کریم نے آگ کو حکم دیا یا نار کونی بردا وسلاماً علی ابراہیم۔ اسے آگ اسی وقت جلانا چھوڑ دے، ٹھنڈی ہو جا مگر برف کی مانند نہیں بلکہ سلامتی والی ـــــ اگر سلاماً نہ کہا ہوتا تو اتنی ٹھنڈی ہو جاتی کہ آپؑ کو تکلیف ہوتی بلکہ یہ فرمایا کہ سلاماً علی ابراھیم۔ کہ انسانی مزاج کے مطابق ہو جائے ـــــ اعتدال کے درجہ میں ہو ایسا نہ ہو کہ ٹھنڈک سے حضرت ابراہیمؑ کو تکلیف ہو ـــــ تو اگر آگ میں زندگی نہ ہوتی تو حکم نہ ملتا۔ جب فرعون کا غرور حد سے بڑھ گیا۔ تو خدا کی گرفت میں آ گیا جیسا کہ آج خدا نے امریکہ کو ویت نام میں پھنسا دیا ہے۔ یہ اس کے غرور تکبر کی سزا ہے کہ جب مغضوب علیہ ذلیل قوم یہود کی پشت پناہی کی ساری دنیا میں تباہی مچائی تو خدا نے پکڑ لیا۔ امریکہ شکست کھانے والی طاقت نہ تھی، مگر آج مولی گاجر کی طرح اسکی فوج کٹ رہی ہے ـــــ یہودیوں کی پشت پناہی کا ثمرہ امریکہ کو مل رہا ہے ـــــ جنگلی اور نہتے لوگوں کے ہاتھوں خدا نے اسے رسوا کر دیا ہے۔ خدا آج بھی اپنی قدرت دکھاتا ہے۔ مگر کاش! ہم دیدۂ عبرت کھولیں اور نصیحت حاصل کریں ـــــ

فرعون کے پاس نو لاکھ فوج تھی۔ حضرت موسیٰؑ کے پاس صرف ایک لاٹھی ہے، آگے سمندر (بحیرۂ قلزم) ہے۔ اور پیچھے نو لاکھ فوج ہے۔ خدا نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا: فاضرب بعصاك البحر۔ اپنے عصا کو سمندر پہ مار دے۔ اگر سمندر میں زندگی نہ ہوتی تو اس نے پیغمبرؑ کے حکم سے خدا کی مرضی کے مطابق تعمیل نہ کی ہوتی ـــــ سمندر بارہ مقامات سے پھٹ گیا بنی اسرائیل کے بارہ اسباط اور قبائل الگ الگ راہوں سے گزر گئے فَانفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ۔ بنی اسرائیل الگ الگ سڑک پر سے گزر گئے اور جب فرعون آیا تو اسی سمندر کی موجوں نے اُسے گھیر لیا اور ساری فوج کے ساتھ غرق ہوا، مجال کیا کہ خدا کے حکم سے کوئی نافرمانی کرے ـــــ

آج بھی سرکش انسانوں کی نافرمانی محض کھیل تماشا ہے۔ جیسے معصوم بچے کو کھلونا دے دیا جاتا ہے تو کبھی وہ کودتا ہے، اچھلتا ہے۔ کبھی گالی دیتا ہے۔ تھپڑ مارتا ہے۔ اور بڑے اُسے دیکھ

ہنستے ہیں کہ یہ کھلونا تو ایک مٹھی میں مسلا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مغرور انسان معمولی اختیار ملنے پر کبھی اسلام کا مقابلہ کرنے لگتا ہے۔ کبھی خدا کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور قدرت ہنستی رہتی ہے کہ یہ انسان اپنی حقیقت اور پوزیشن کو بھولے ہوئے ہے۔

تم اپنے آپ کو دیکھو اور اس آسمان کو دیکھو، چاند اور سورج کو دیکھو۔ تم میں سے تو بڑے بڑے اجسام خدا کے سامنے منقاد ہیں۔ اس وجہ سے حضرت لقمان نے بیٹے کو نصیحت کی۔ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ بیٹے زمین پر اکڑ کر مست چلو۔۔۔۔ تم زمین تو نہیں پھاڑ سکتے، نہ پہاڑ کو ٹکر مار سکتے ہو۔ پس جب یہ تم سے زیادہ مضبوط ہیں تو کیوں غرور اور تکبر اختیار کرتے ہو۔ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا۔ تم نہ تو زمین اپنی اکڑ سے پھاڑ سکتے ہو اور نہ سینہ تان کر چلنے سے پہاڑوں کے برابر لمبے ہو سکتے ہو۔ بہرحال خدا کے انعامات سب پر ہیں اور انعامات کی وجہ سے خدا سے کائنات کو محبت ہے اور محبت کا تقاضا اطاعت ہے۔ اور اس وجہ سے تمام کائنات منقاد رب ہے۔

یاد رکھیں آپ کے دل میں خدا کی محبت کا خدا کو کوئی فائدہ نہیں وہ کسی کا حاجتمند نہیں ہم اس کے محتاج ہیں، ہمیں اپنے فائدہ کیلئے خدائی نعمتوں کا تصور اور احساس کرنا چاہئے۔ فائدہ یہ ہوگا کہ اسکی وجہ سے ہمارے اندر اطاعت و فرمانبرداری پیدا ہوگی جو کہ موجب سکون ہوگی۔ اور ہر قربانی موجب خوشنودی و راحت ہوگی۔ بوجھ محسوس نہیں ہوگا۔۔۔۔ ہم سب محبت کی وجہ سے اہل وعیال کے لئے دنیا بھر کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں اور ہمیں کلفت محسوس نہیں ہوتی بلکہ بچوں کو دیکھ لیں تو خوشی کے مارے کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے اور ساری تھکاوٹ زائل ہو جاتی ہے۔ یہ سب محبت طبعی کا نتیجہ ہے کہ ہر تکلیف اور مصیبت اولاد کیلئے عین راحت، عین سکون اور اطمینان کا باعث بن گئی، تو محبت خداوندی کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسکی وجہ سے ہر حکم کی تعمیل خوشی سرور اور اطمینان کا باعث بن جائے گی اور جتنی بھی عبادت کی جائے گی اس سے دل کو سکون نصیب ہوگا۔

بھائیو! محبت سے عجیب عجیب کرشمے ظاہر ہوتے ہیں۔ محبت تو حضرت بلالؓ کی تھی کہ جب کلمۂ توحید پڑھا تو ان کے مالک امیہ نے اذیت دینے کیلئے ایک ہی وار میں انہیں قتل نہ کرنا چاہا تاکہ عذاب و تکلیف زیادہ سے زیادہ دی جائے ورنہ وہ یہ کر سکتا تھا کہ چھری سے کہ ذبح کر دیتا۔ آزاد ملک تھا، قانون اور حکومت نہ تھی۔ مگر گرم ریگستان میں تپتی دھوپ میں بلالؓ کو ڈال دیا جاتا اور بڑے بڑے پتھر سینہ اور پاؤں پر رکھ دئے جاتے، رات کو تازہ دم غلام اور نوکر مارتے پیٹتے کہ

سو نہ جائیں۔ مگر وہ اللہ کا بندہ پکارتا۔ احدٌ۔ احدٌ۔ احدٌ (اللہ ایک ہے) ـــــــ وہ بھی ہماری طرح گوشت پوست ہی سے بنے تھے، تکلیف انہیں ہوتی تھی، مگر محبت تھی اور احدٌ کے ورد سے سکونِ قلبی ملتا تھا۔ محبوب کے نام کے لطف میں تکلیف بھول جاتے۔

ایک بادشاہ نے اپنی بیٹی کے نکاح کیلئے یہ شرط لگا دی کہ جس نے موسم سرما کی ساری رات تالاب میں گزاری اسے اپنی لڑکی بیاہ دوں گا۔ بہت سے یاروں نے ہمت کی مگر تھوڑی دیر گزار کر بھاگ اٹھتے، ایک باہمت شخص نکل آیا اس نے ساری رات گزاری مگر مرا نہیں۔ تو لوگوں نے پوچھا کہ کیسے زندہ بچ گئے۔ کہا کہ ایک تو بادشاہ کی بیٹی سے نکاح کا تصور تھا اور دوسری یہ کہ رات کو پہاڑی پر دور سے آگ کی ایک روشنی نظر آرہی تھی میں اس کے سامنے تپتے رہنے کا تصور کرتا اسطرح رات گزری تو شرط جیت گیا اور بادشاہ کی لڑکی سے نکاح ہو گیا ـــــــ یہ تو مجازی عشق تھا ـــ تو عاشقِ حقیقی کے تصور کا کیا حال ہوگا ـــــــ!

حضرت بلالؓ تو خدا کا تصور کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کفار نے مارا پیٹا یہاں تک کہ سر اور بدن کا کوئی حصہ زخم سے نہ بچ سکا۔ ان کی والدہ کہتی ہیں کہ سر پہ انگلی رکھنے سے بال اکھڑنے لگتے بکھر لائے گئے، بے ہوش تھے، ہوش میں آنے کے بعد ان کی ماں ام الخیر نے جو سرہانے بیٹھی تھی طبیعت کا حال پوچھا تو جواب میں انہوں نے یہ پوچھا کہ حضورؐ کا کیا حال ہے۔ دراصل حضورؐ مسجد حرام میں نماز پڑھ رہے تھے کہ کفار نے احاطہ کر لیا۔ حضرت صدیقؓ نے آکر یہ منظر دیکھا تو لوگوں کو روکنا چاہا اور فرمایا: اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ۔ کیا تم صرف اس وجہ سے اس شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے ـــــ تو لوگ ان کو مارنے لگے، یہاں تک کہ مار مار کر بیہوش کر دیا۔ خیر جتنی بار والدہ نے حالت پوچھی انہوں نے جواب میں یہی کہا کہ حضورؐ کا کیا حال ہے ـــــــ ماں نے حضورؐ کی حالت دریافت کرنی چاہی تو لوگوں نے بتایا کہ حضرت عمرؓ کی بہن مسلمان ہے ان کے ذریعہ پتہ چلے گا۔ تو ام الخیر حضرت عمرؓ کی بہن کے ہاں گئیں کہ حضور کی حالت معلوم کریں، وہاں سے دونوں ایک ساتھ ہو کر حضورؐ کے ہاں گئیں اور مزاج پرسی کر کے واپس آئیں۔ پھر حضرت صدیقؓ نے آپ کی حالت دریافت کی، فرمایا ہاں ابھی آئی ہوں الحمدللہ وہ ٹھیک ہیں۔ پھر دوائی یا غذا دینی چاہی فرمایا اے ماں جب تک حضورؐ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں دوائی وغیرہ نہیں پی سکتا۔ ابوبکر ام الخیر کے ساتھ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دعا فرمائیں کہ میری والدہ مسلمان ہو جائے۔ دعا کی برکت سے مسلمان ہوئیں ـــــــ یہ تھی محبت کہ تکلیف محسوس نہ ہوئی بلکہ محبوب کا تصور راحت کا

سبب بنتا رہا۔

محبت میں مال وجان اور اولاد کی قربانی محبّ کیلئے بڑی آسان ہوجاتی ہے۔ اور کامیابی بھی تب ہی ہوتی ہے۔ دیکھو کفار اگر فتح حاصل کرتے ہیں، تو دل میں وطن کی محبت ہوتی ہے اور دنیادار کے دل میں مال کی محبت ہوتی ہے، تب کامیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر طالب العلم کے دل میں علم کی محبت ہو تو عالم بنے گا، ورنہ نہیں۔ اور محبت کا یہ فائدہ ہے کہ پھر کوئی کام مشکل معلوم نہ ہوگا۔

محبت کا ایک منظر وہ بھی ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا۔ خداوند تعالیٰ نے ان کی آزمائش کرنا چاہی۔ بڑھاپے میں بچہ عطا کیا ــــ حضرت اسماعیلؑ ۱۱، ۱۲ سال کی عمر کے تھے اور مستقبل میں پیغمبر بننے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش ہوئی۔ خواب میں دیکھا جس سے یہ ظاہر ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے بیٹے کی محبت اللہ تعالیٰ کے حکم سے قربان کردی ہے۔ چنانچہ سیدنا ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو کہا:

اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی قَالَ یٰاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۔	اے بیٹے میں نے خواب میں تجھے ذبح کرتے ہوئے دیکھا اب تیری کیا مرضی ہے؟ سعادت مند بیٹے نے جواب دیا۔ اے باپ اپنے خواب کو پورا فرما دیجئے انشاء اللہ مجھے صبر کرنیوالوں میں سے پائیں گے۔

...

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنی تعریف اور بڑائی نہیں کی، جیسے آج کل لوگ بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ اللہ نے چاہا تو میں صبر کروں گا ــــ باپ عاشق ہے اور تقریباً ۱۲۰ سال کا بوڑھا ضعیف اور بیٹا صرف ایک ــــ آثار نجابت چہرہ سے نمایاں ہیں مگر محبت کا امتحان ہے خدا کی طرف سے ــــ پیغمبر کو وحی آتی ہے جس کی اقسام ہیں ــــ آپؑ کو جاگتے میں وحی آسکتی تھی مگر اس آزمائش کی وحی نیند میں آئی۔ خدا نے چاہا کہ آپ کی شان اونچی ہوجائے اور دنیا میں ظاہر ہوجائے کہ ایسے عاشق بھی ہوتے ہیں ــــ لوگ خواب دیکھتے ہیں تو صبح اٹھ کر تاویل وتعبیر کرنے بیٹھتے ہیں۔ مگر خدا نے دنیا کو بتا دیا کہ میرے عاشق اسطرح بن جاؤ کہ تعبیر و تاویل کو چھوڑ دو بس جس بات کو دیکھو اس پہ یقین کرلو اور اس کی تعمیل میں لگ جاؤ۔

ہمیں قرآن نماز کا حکم دیتا ہے، قرآن پاک میں غالباً پانچ سو جگہ سے زیادہ میں نماز کا حکم ہے اور یہ حکم حضرت جبرائیلؑ کے ذریعہ جاگتے میں اتارا گیا ہے۔ پھر بھی ہم اس سے روگردانی کرتے ہیں۔

اور ایک وہ عاشق ہے خدا کا کہ نیند میں اشارہ ہوتا ہے اور وہ فوراً مستعد اور تیار ہو جاتا ہے اور پھر بیٹا کیسا ہے ــــ؟ آج لوگ بیٹے کو کسی بڑے کام سے روک نہیں سکتے کہ کہیں وہ گلے نہ پڑ جائے ـــ ایک یہ اولاد ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کہ انہیں باپ نے کہا بیٹا صاف صاف بات ہے کہ میں نے تمہیں نیند میں ذبح کرتے دیکھا ہے اللہ کے حکم سے ـــ اور میں نبی ہوں کہ جس کا خواب وحی ہے ۔ بیٹے نے کہا اس سے زیادہ خوشی کی بات کونسی ہوگی کہ خدا کی راہ میں قربان ہو جاؤں ــــ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، وہ غیرت والی ذات ہے، بندہ کی نیت و اخلاص دیکھتا ہے ــــــ سیدنا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے جب سر تسلیم خم کیا تو سیدنا ابراہیمؑ کو بدلا ملا۔ اور انہیں خدا نے ساری دنیا کی امامت دی اور ان کے بعد سیدنا اسماعیل علیہ السلام کو بھی حضور خاتم النبیینؐ کا جد امجد بنا کر قیامت تک دنیا کا امام بنایا۔ انبیاء کرام میں دونوں کو خدا نے ایک عظیم مقام دیا۔ آج انہی کی بنائی ہوئی مسجد بیت اللہ کا رخ کر کے ہم نماز پڑھتے ہیں تب قبول ہوتی ہے ۔ نماز کے آخر میں درود پڑھتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ اور انکی اولاد بھی یاد ہوتی ہے ــــــ

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی قبول ہوئی، وہ زندہ رہے اور قربانی کا طریقہ قیامت تک جاری کر دیا۔ وترکنا علیہ فی الآخرین ۔ ہم نے اسماعیل کی قربانی کے بدلے دنبہ بھیج دیا جو ذبح ہوا۔ اور یہ طریقہ ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا۔ آپؑ سے لیکر حضورؐ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر خود حضورؐ نے اس کا اہتمام فرمایا۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ خود حضورؐ نے دس سال تک مدینہ طیبہ میں ہر سال دو قربانیاں دیں۔ ایک اپنی طرف سے اور ایک اپنی امت کی طرف سے قربانی فرمائی کہ امت کے جو لوگ غریب ہیں اور قربانی نہیں کر سکتے ان کے لئے بھی قیامت کے دن کی سواری کا انتظام ہو جائے ــــ

حضرت علیؓ بھی ہر سال دو قربانیاں کرتے تھے ۔ ایک اپنی طرف سے ، ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ۔

بھائیو! افسوس ہے کہ اب قربانی کا عمل ختم ہو رہا ہے ــــ عقیدہ اور ایمان بھی ختم ہو رہا ہے۔ عام لوگ کہنے لگے ہیں کہ قربانی کی حکمت کیا ہے۔؟ فائدہ کیا ہے۔؟ مال کیوں ضائع کیا جائے؟ اس کی قیمت جمع کر کے قومی کاموں میں کیوں نہ لگائی جائے ۔ کشمیر فنڈ یا کسی دوسرے قومی فنڈ میں کیوں نہ دی جائے ــــــ مگر یاد رکھئے ! حضورؐ نے فرمایا کہ : ماعمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم (اوکما قال) عید قربان کے دن اللہ کو کوئی دوسری نیکی قربانی سے

زیادہ محبوب نہیں ــــ اگر آپ دس بیس روپے کی قربانی کے عوض دس ارب روپے بھی کسی دوسرے نیک کام پر لگا دیں تو قربانی سے ذمہ فارغ نہ ہوگا ــــ دیکھئے اگر یہاں ایک شخص بھوکا ہے روٹی کا محتاج ہے اور تم اسے دس ارب روپے کا سونا دے دو تو کیا اسکی روٹی کی خواہش یا بھوک صرف سونے کو دیکھ کر ختم ہو جائے گی۔؟ اسکی زندگی ہرگز اس سے نہیں بچ سکے گی۔ اسکو روٹی اور پانی کی ضرورت ہے ــــ دنیا میں ایک کام کی جگہ دوسرا کام کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قربانی کی بجائے روپیہ دینا ٹھیک نہیں۔ دنیا و آخرت کی نعمتوں میں فرق ہے، آخرت کی نعمتیں اور بخشش اعمال اور نیکیوں کے بدلے میں ملتی ہیں۔ اور دنیا کی نعمتیں بلا عمل مل رہی ہیں۔ ہم نے اپنی پیدائش سے قبل کوئی نیکی نہیں کی مگر خدا ہمیں دنیا میں پالتا ہے۔ مسلمان ہوں یا کافر سب کو روٹی دیتا ہے، اور پالتا ہے۔ مگر یہ دنیا کا معاملہ ہے۔

آخرت کی ہر نعمت اور اجر کیلئے الگ الگ عمل مقرر ہے۔ مغفرت کیلئے الگ عمل، جنت کیلئے الگ عمل۔ نیکیوں کا ثواب اگر چاہتے ہو تو الگ عمل کرو۔ خدا کا دیدار چاہتے ہو تو اس کے لئے الگ عمل کرنا ہوگا ــــ آیت جو تلاوت کی قیامت کے بارہ میں ہے۔ کہ وہاں ہر انسان کو اپنے عمل کا بدلہ ملے گا اور ساری کوشش اور محنت اس کے سامنے آجائے گی ــ ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ اور پھر اللہ نے بعض امور کے کئی اسباب بھی پیدا کیے ہیں۔ مگر ہر عمل کا اجر دوسرے عمل کی وجہ سے حاصل نہیں ہوتا ــــ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ اگر کسی نے عصرین یعنی صبح اور عصر کی نماز قضا نہ کی اور باجماعت پڑھی تو خداوند تعالیٰ اسے اپنے دیدار سے مشرف فرما دیں گے ــــ اب اگر کوئی دن بھر نیکی کرے مگر نماز نہ پڑھے تو چونکہ اس کے پاس رویت خداوندی کا ٹکٹ نہیں وہ اس میں کامیاب نہ ہوگا ــ یہ مولویوں کی تنگ نظری نہیں، دنیا میں دیکھئے تم کسی کو ایک خط بھیجنا چاہو اور ٹکٹ لگانے کی بجائے اس کے ساتھ سو روپے کا نوٹ چسپاں کر دو تو کیا یہ جرمانہ سے بچ جائے گا۔؟ نہیں، وہ بیرنگ ہو جائے گا۔ یعنی وہاں سو روپے کام نہ دیں گے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کیسا احمقانہ قانون ہے کہ ۱۵ پیسے کے ٹکٹ کی بجائے سو روپے لگا دیے اور پھر بھی جرمانہ ہو گیا۔ تو جواب ملے گا کہ عقل سے کام لو، حکومت نے ٹکٹ لگانے کا قانون بنایا ہے۔ اس کے بغیر دس لاکھ روپے بلا قانون لگا دو پھر بھی مجرم ہو گے۔

یہ مت خیال کرو کہ دنیا میں سرکشی کے باوجود کھانا پینا ملتا ہے، لہٰذا آخرت میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ نہیں، وہ تو نتیجے کا دن ہے، جو کام نیکی کا یہاں کیا اس کا پھل وہاں ملے گا ــــ حضرت

فاطمہؓ کو حضورؐ نے فرمایا کہ قربانی دو، اس کے ہر قطرۂ خون کے بدلے تمہارے گناہ معاف ہوں گے۔ اور بھیڑ بکری وغیرہ کے ہر بال کے عوض خدا نیکی کا اجر دیگا۔

یاد رکھیئے! عاجزی اور خشوع کا الگ اجر ہے، جو نماز ہی کے ذریعہ مل سکتا ہے۔ اگر ایک شخص دن بھر خدا تعالیٰ کو سلام کرتا رہے، تسبیح ہاتھ میں لئے ذکر کرتا رہے مگر نماز نہ پڑھے تو وہ اجر کبھی نہیں ملے گا جو پنجوقتہ نماز سے ملتا ہے۔

قربانی خدا کی راہ میں عاشق کے عشق کا آخری مرحلہ ہے ـــــ قربانی کی بجائے اگر آپ اربوں روپے بھی دے دیں تو وہ ثواب نہیں ملے گا جو قربانی سے ملتا ہے۔ اور قیامت کے دن ہر عمل کے مطابق جزا ملے گی۔ قربانی کی بجائے آپ کسی دوسرے عمل سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ـــــ اللہ تعالیٰ سب کو قربانی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

قربانی کے احکام

ہر مسلمان آزاد مقیم جو کہ ضروریات زندگی کے علاوہ مقدار نصاب یعنی ۷½ تولہ سونا یا ۵۲½ تولہ چاندی یا اس کی قیمت کا مالک ہو، اس پر قربانی کرنا واجب ہے، قربانی میں بکرا یا بھیڑ یا دنبہ یا ساتواں حصہ اونٹ، گائے، بیل، بھینس کا ایک آدمی کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ جن جانوروں میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں وہ سات سے کم تعداد کے لئے بھی جائز ہیں۔ بکرا ایک سال کا ہونا چاہیئے، اور بھیڑ، دنبہ اگر موٹا ہو اور چھ ماہ سے زائد کا ہو تو ہو سکتا ہے۔ اونٹ پانچ سال کا ہونا چاہیئے۔ باقی بڑے جانور دو سال کے کافی ہیں۔ نر و مادہ دونوں کی قربانی جائز ہے۔

قربانی کا گوشت وزن سے تقسیم کیا جائے، اندازے سے تقسیم نہ کریں۔ لیکن اگر کسی طرف پائے کھال بھی لگا دئے جائیں تو اندازہ سے بھی تقسیم کرنا درست ہے۔

شہر والے قربانی بعد نماز کریں اور اگر کسی عذر سے اس دن نماز نہ ہوئی تو جس وقت نماز کا وقت گذر جائے اس وقت قربانی کرنا درست ہے یعنی بعد زوال کے۔ اور دوسرے تیسرے دن نماز سے پہلے بھی قربانی درست ہے یعنی اگر نماز بقرعید کسی عذر سے قضا ہو گئی تو اگلے دن نماز سے پہلے بھی قربانی جائز ہے۔ اسی طرح بارھویں تاریخ کو بھی۔ اور گاؤں والوں کو دسویں تاریخ کی صبح صادق ہونے کے بعد بھی قربانی کرنا درست ہے۔

قربانی کے تین دن ہیں۔ دسویں، گیارہویں، بارھویں ذی الحجہ کی۔ مگر پہلے دن قربانی کرنا افضل ہے، پھر دوسرے دن۔ پھر تیسرے دن۔ غروب آفتاب سے پہلے قربانی ہو سکتی ہے۔

رات کو قربانی کرنا جائز ہے، پسندیدہ اور بہتر نہیں۔

اپنی قربانی کو خود ذبح کرنا بہتر ہے۔ اگر خود ذبح کرنا نہیں جانتا تو دوسرے سے ذبح کرانے کے وقت خود وہاں کھڑا ہو جانا بہتر ہے۔

قربانی کے وقت کوئی نیت زبان سے پڑھنا ضروری نہیں۔ اگر صرف دل میں خیال کر لیا کہ میں قربانی کرتا ہوں اور زبان سے کچھ نہیں کہا، صرف بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دیا تب بھی قربانی درست ہے

اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت

یہ مقالہ حضرت مفتی صاحب مدظلہ نے ۱۳ر فروری کو راولپنڈی کی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جسے ہر طبقہ فکر نے بے حد سراہا، اجلاس میں شریک سنجیدہ اور فہیم حضرات سے بڑے اچھے تاثرات سننے میں آئے۔ آج کل عالم اسلام کو جن مسائل کا سامنا ہے اس بارہ میں قارئین حضرات کو رسوخ علمی رکھنے والے متدین اکابر کے مقالات اور مضامین کو دلچسپی اور انہماک سے پڑھنا چاہیئے۔ اذہان سطحی مطالعہ سے نہیں بنتے۔ سنجیدہ، علمی اور ٹھوس مطالعہ سے گریز کرتے ہوئے ڈائجسٹوں اور عام مجلات کے افسانوی مضامین ہی پر اکتفا کرنا علم و فکر کے اضمحلال کا باعث اور سطحیت کی علامت ہے۔ گو ہم حتی الوسع اپنے عام قارئین کے لئے عام فہم اور آسان زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر پھر بھی آج وقت کے فتنوں اور علمی و فکری گمراہیوں کے تعاقب میں علمی مقالات اور مضامین کی اشاعت ایک ضروری امر ہے۔ امید ہے قارئین حضرات اس مضمون کو بھی بڑے شغف اور یکسوئی سے پڑھیں گے۔

......(سمیع الحق)......

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔

"تقسیم دولت" کی بحث معاشی زندگی کے ان اہم ترین مباحث میں سے ایک ہے جنہوں نے آج کی دنیا میں عالمگیر انقلابات کو جنم دیا ہے۔ اور عالمی سیاست سے لیکر ایک فرد کی نجی زندگی تک ہر شعبہ اس سے متاثر ہوا ہے۔ صدیوں سے اس موضوع پر زبانی قلمی اور حربی معرکے گرم ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وحی الٰہی" کی رہنمائی کے بغیر نری عقل کے بل پر اس موضوع کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس نے اس الجھی ہوئی گتھی کے خم و پیچ میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے ——

زیر قلم مقالے میں پیش نظر یہ ہے کہ قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کی کاوشوں سے اس

معاملے میں "اسلام" کا جو نقطۂ نظر سمجھ میں آتا ہے۔ اسے واضح کیا جائے۔ وقت کی تنگی اور صفحات کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں ہے کہ اس موضوع کو پورے بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ البتہ اس کے اہم نکات کو اختصار مگر جامعیت کیساتھ عرض کرنے کی کوشش کی جائیگی۔

قرآن و سنت اور اسلامی فقہ سے "تقسیم دولت" کے بارے میں اسلام کا جو موقف احقر نے سمجھا ہے اسے بیان کرنے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بنیادی باتیں واضح کر دی جائیں۔ جو اسلامی معاشیات کے تقریباً ہر مسئلے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں، انہیں آپ "نظریۂ تقسیم دولت کے اصول" کہہ لیجئے۔ اس کا "فلسفہ" سمجھ لیجئے یا اس نظریئے کے مقاصد قرار دیجئے۔ بہر حال یہ چند وہ باتیں ہیں جو قرآن کریم سے اصولی طور پہ سمجھ میں آتی ہیں۔ اور اسلام کے معاشی طرز فکر کو غیر اسلامی معاشیات سے ممتاز کرتی ہیں۔

معاشی مسئلہ کا مقام | اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور انسان کی معاشی سرگرمیوں کو جائز، مستحسن، بلکہ بسا اوقات واجب اور ضروری قرار دیتا ہے۔ انسان کی معاشی ترقی اس کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اور "کسب حلال" اس کے نزدیک "فریضۃ بعد الفریضۃ" یعنی دوسرے درجہ کا فرض قرار دیتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ یہ حقیقت بھی اتنی ہی صداقت رکھتی ہے کہ اسکی نظر میں انسان کا بنیادی مسئلہ "معاش" نہیں ہے۔ اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا مقصد زندگی ہے۔

معمولی سوجھ بوجھ سے یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے۔ کہ کسی کام کا جائز، مستحسن یا ضروری ہونا ایک الگ بات ہوتی ہے۔ اور اس کا مقصد زندگی اور محور فکر و عمل ہونا بالکل جدا چیز۔ اسلامی معاشیات کے معاملے میں بہت سی غلط فہمیاں انہی دو چیزوں کو خلط ملط کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے پہلے قدم پر اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے۔ درحقیقت اسلامی معاشیات اور مادی معاشیات کے درمیان ایک بڑا گہرا، بنیادی اور دور رس فرق یہی ہے کہ مادہ پرستانہ معاشیات میں "معاش انسان کا بنیادی مسئلہ" اور معاشی ترقیات اسکی زندگی کا منتہائے مقصود ہیں۔ اور اسلامی معاشیات میں یہ چیزیں ضروری اور ناگزیر سہی لیکن انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں ہیں۔ اس لئے جہاں ہمیں قرآن کریم میں "رہبانیت" کی مذمت اور "وابتغوا من فضل اللہ" کے احکام ملتے ہیں۔ جہاں ہمیں تجارت کیلئے "فضل اللہ" اموال کیلئے "خیر" اور "التی جعل اللہ لکم قیاماً" خوراک کیلئے "طیبات من الرزق" لباس کیلئے "زینۃ اللہ" اور رہائش کیلئے "سکن" کے احترامی

القاب ملتے ہیں۔ وہاں دنیوی زندگی کیلئے "متاع الغرور" کے الفاظ بھی نظر آتے ہیں۔ اور ان سب چیزوں کیلئے "الدنیا" کا لفظ ملتا ہے، جو اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے کچھ اچھا تاثر نہیں دیتا اور قرآن کریم کے مجموعی اسلوب سے بھی اسکی دناءت اور حقارت سمجھ میں آتی ہے۔

کوتاہ نظری اس موقعہ پر تضاد کا شبہ پیدا کرسکتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس کے پیچھے اصل راز یہی ہے کہ قرآن کریم کی نظر میں تمام وسائل معاش انسان کی رہگذر کے مرحلے ہیں۔ اسکی اصل منزل درحقیقت ان سے آگے ہے، اور وہ ہے کردار کی بلندی اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اسکی زندگی کا بنیادی مقصد انہی دو منزلوں کی تحصیل ہے۔ لیکن چونکہ ان دو منزلوں کو دنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کیلئے ضروری ہوجاتی ہیں جو اسکی دنیوی زندگی کے لئے ضروری ہیں چنانچہ جب تک وسائل معاش انسان کی اصلی منزل کے لئے رہگذر کا کام دیں وہ "فضل اللہ" "خیر" "زینة اللہ" اور "سکن" ہیں۔ لیکن جہاں انسان اسی رہگذر کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائے اور اس پر اپنی اصل منزل مقصود کو قربان کر ڈالے یا بالفاظ دیگر وسائل معاش کو "رہگذر" بنانے کی بجائے اپنی منزل مقصود کے راستے میں رکاوٹ بنادے تو پھر یہی وسائل معاش "متاع الغرور" "فتنہ" اور "عدو" بن جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے ایک مختصر جملے "وابتغ فی ما آتاك اللہ الدار الآخرة" میں اس بنیادی حقیقت کو بیان فرمایا ہے اس کے علاوہ اس مضمون کی بہت سی آیات ہیں، اہل علم کے سامنے تمام آیات کو ذکر کرنیکی ضرورت نہیں۔ احقر کی رائے میں "انسانی معاش" کے متعلق قرآن کریم کی یہ روش اور اس کے دو مختلف پہلو نظر میں رہیں تو اسلامی معاشیات کے بہت سے مسائل حل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دولت اور ملکیت کی حقیقت دوسری بنیادی بات جو خاص طور سے "تقسیم دولت" کے مسئلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ ہے کہ قرآن کریم کی تصریح کے مطابق "دولت" خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ کی پیدا کردہ اور اصلاً اسی کی ملکیت ہے۔ انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے۔ سورہ نور میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وآتوهم من مال اللہ الذی آتاکم۔ اور انہیں اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے۔ ...

اس کی وجہ بھی قرآن کریم نے ایک دوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کرسکتا ہے کہ عمل پیدائش میں اپنی کوشش صرف کرے۔ لیکن اس کوشش کو بار آور کرنا اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کرسکتا ہے۔ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے لیکن اس بیج کو کونپل اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے۔ ارشاد ہے:

اَفَرَءَیتُم مَّا تَحرُثُونَ ءَاَنتُم تَزرَعُونَہٗ	دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اسے
اَم نَحنُ الزّٰرِعُونَ ۔	اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے۔

نیز ارشاد ہے:

اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت	کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لئے
ایدینا انعاما فھم لھا مالکون ۔	جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بنا کر پیدا کیا۔ پھر وہ
	اس کے مالک بن گئے۔

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی ملکیت ہے، اور اسی کی عطا سے انسان کو ملی ہے۔ پھر اسلام کی نظر میں چونکہ "دولت" بر اصل ملکیت اللہ کی ہے اور اس نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر انسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور مصالح عالم کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیر تصرف اشیاء پر "ملکیت" تو حاصل ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد خود مختار اور بے لگام نہیں ہے۔ اس پر "دولت" کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود، قیود اور پابندیاں عائد ہیں۔ جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دے دے وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے اور جہاں خرچ کی ممانعت کر دے، وہاں رک جانا لازم ہے۔ اسی بات کو سورہ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔

وابتغ فیما آتاک اللہ الدار الآخرۃ	جو تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے پچھلے گھر
ولا تنس نصیبک من الدنیا	(آخرت) کا توشہ کمالے اور دنیا سے اپنا حصہ
واحسن کما احسن اللہ الیک	نہ بھول اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے
ولا تبغ الفساد فی الارض ۔	بھلائی کی ہے اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔

اس آیت نے اسلام کے فلسفہ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرما دیا ہے۔ اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے وہ اللہ کی دی ہوئی ہے۔ (آتاک اللہ)

۲۔ انسان کو اس کا استعمال اس طرح کرنا ہے کہ اسکی منزل مقصود دار آخرت ہو۔ (وابتغ .... الدار الاخرۃ)

۳۔ چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ لہذا اس پر انسان کا تصرف حکم خداوندی کے تابع ہوگا اب حکم خداوندی کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ یہ مال کسی دوسرے کو دیدو۔ اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر احسان کیا ہے۔ تو وہ تمہیں دوسرے پر احسان کا حکم دے سکتا ہے۔ (واحسن کما احسن اللہ الیک)

۴۔ دوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے کسی تصرف سے منع کرے۔ اس کا بھی اسکو اختیار ہے۔ کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے استعمال کی اجازت نہیں دے سکتا، جس سے اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں اور زمین میں شر و فساد پھیلے۔ (ولا تبغ الفساد فی الارض)

یہی وہ چیز ہے جو اسلام کو سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ نظری یا عملی طور پر مادیت ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے۔ وہ اسکو جس طرح چاہے رکھ سکتا ہے۔ لیکن قرآن کریم نے قوم شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریئے کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے۔ وہ لوگ کہا کرتے تھے۔

اصلاتک تامرک ان نترک	کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ
مایعبد آباءنا اوان نفعل	ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں
فی اموالنا ما نشاء۔	یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف
(سورۃ ہود)	کرنا ترک کر دیں۔

وہ لوگ چونکہ "اموال" کو حقیقۃً اپنا (اموالنا) سمجھتے تھے اس لئے "نفعل ما نشاء" (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ یہی فکر سرمایہ داری کی روح ہے۔ اور قرآن کریم نے سورۃ نور میں "اموالنا" (اپنے اموال) کے لفظ کو "مال اللہ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اس بنیاد پر ضرب لگائی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی "الذی آتاکم" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ جو سرے سے انسان کی انفرادی ملکیت ہی کا انکار کرتی ہے۔ اسی طرح سورہ یسین کی آیت "فہم لہا مالکون" نے بذریعہ عطاء حق تعالیٰ انفرادی ملکیت کو واضح کر دیا ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان واضح خطِ امتیاز اس طرح کھینچا جا سکتا ہے کہ:

سرمایہ داری —— آزاد اور خود مختار انفرادی ملکیت کی قائل ہے۔
اشتراکیت —— انفرادی ملکیت کا سرے سے انکار کرتی ہے۔

اور حق ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔ یعنی:

اسلام —— انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ مگر یہ ملکیت آزاد اور خود مختار نہیں جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔

تقسیم دولت کے اسلامی مقاصد | اسلام نے تقسیم دولت کا جو نظام مقرر کیا ہے۔ اور جس کا خاکہ انشاء اللہ آگے پیش کیا جائے گا۔ قرآن کریم پر غور کرنے سے اس کے تین مقاصد معلوم ہوتے ہیں:

الف۔ ایک قابلِ عمل نظام معیشت کا قیام —— تقسیم دولت کا سب سے پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ دنیا میں معیشت کا ایک ایسا نظام نافذ کیا جائے جو فطری اور قابلِ عمل ہو۔ اور جس میں ہر انسان جبر و تشدد کی بجائے قدرتی طور پر اپنی لیاقت، اپنی استعداد، اپنے اختیار اور اپنی پسند کے مطابق خدمات انجام دے۔ تاکہ اس کی خدمات زیادہ موثر، مفید اور صحت مند ہوں۔ اور یہ بات مستاجر (جسے مروجہ معاشی اصطلاح میں آجر کہا جاتا ہے) اور "آجر" کے صحت مند رشتے اور "رسد" و "طلب" کی فطری قوتوں کے صحیح استعمال[1] کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اسلام نے انہیں تسلیم کیا ہے۔

اس بات کی طرف مندرجہ ذیل آیات میں جامع اشارہ فرمایا گیا ہے:

نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا ...	ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو دنیوی زندگی میں تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کے اعتبار سے فوقیت دی ہے۔ تاکہ انہیں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

---

[1] صحیح استعمال کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان قوتوں کا غلط استعمال بھی ممکن ہے اور سرمایہ داری میں ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے انفرادی ملکیت کی بے لگامی کو ختم کرکے اس غلط استعمال کی بیخ کنی کی ہے۔

ب۔ حق کا حقدار کو پہنچانا —— اسلام کے نظامِ تقسیم دولت کا دوسرا مقصد حق کا حقدار کو پہنچانا ہے۔ لیکن اسلام میں استحقاق کا معیار دوسرے نظام ہائے معیشت سے قدرے مختلف ہے۔ مادی معاشیات میں دولت کے استحقاق کا صرف ایک راستہ ہوتا ہے اور وہ ہے عمل پیدائش میں شرکت، جتنے عوامل دولت کی پیداوار میں شریک ہوتے ہیں، انہیں کو دولت کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اور بس! اس کے برخلاف اسلام کا بنیادی اصول چونکہ یہ ہے کہ دولت اصلاً اللہ کی ملکیت ہے اور وہی اس کے استعمال کے قوانین مقرر فرماتا ہے۔ اس لئے اسلام میں دولت کے حقدار صرف عاملین پیدائش ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر وہ شخص بھی دولت کا مستحق ہے جس تک دولت کا پہنچانا اللہ نے ضروری قرار دیا ہے — لہذا فقراء و مساکین اور معاشرے کے نادار اور بیکس افراد بھی دولت کے حقدار ہیں، اس لئے کہ جن عوامل پیدائش پر اولاً دولت تقسیم ہوتی ہے ان کے ذمے اللہ نے لازم کیا ہے کہ وہ ان تک اپنی دولت کا کچھ حصہ پہنچائیں اور قرآنی تصریحات کے مطابق یہ مفلسوں اور ناداروں پر ان کا کوئی احسان نہیں ہے، بلکہ وہ فی الواقعہ دولت کے مستحق ہیں، ارشاد ہے:

فی اموالہم حق معلوم للسائل والمحروم۔	اور ان کے اموال میں سائل اور محروم کا ایک متعین حق ہے۔

اس حق کو بعض مقامات پر اللہ کا حق قرار دیا گیا ہے۔ کھیتیوں کے بارے میں فرمایا جاتا ہے:

وآتوا حقہ یوم حصادہ ۔	اور اس (کھیتی) کے کٹنے کے دن اسکا حق ادا کرو۔

ان دونوں آیتوں میں "حق" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ استحقاق دولت کا ماخذ صرف عمل پیدائش ہی نہیں ہے بلکہ مفلس و نادار افراد بھی دولت کے ٹھیک اسطرح مستحق ہیں جسطرح اس کے اولیں مالک —— لہذا اسلام دولت کو اس طرح تقسیم کرنا چاہتا ہے کہ اس سے تمام عوامل پیدائش کو ان کے عمل کا حصہ بھی پہنچ جائے اور اس کے بعد ان لوگوں کو بھی ان کا حصہ مل جائے جنہیں اللہ نے مستحق دولت قرار دیا ہے۔ (ان دونوں قسم کے حقداروں کی تفصیل آگے انشاء اللہ آئے گی)

ج۔ ارتکاز دولت کی بیخ کنی —— تقسیم دولت کا تیسرا مقصد جسکو اسلام نے بہت اہمیت دی ہے یہ ہے کہ دولت کا ذخیرہ چند ہاتھوں میں سمٹنے کی بجائے معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے۔ اور اسطرح امیر و غریب کا

تفاوت جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں اسلام کا طرزِ عمل یہ ہے کہ دولت کے جو اوّلیں ماخذ اور ذرائع ہیں ان پر اس نے کسی فرد یا جماعت کا پہرا نہیں بیٹھنے دیا بلکہ معاشرے کے ہر فرد کو ان سے استفادے کا مساوی حق دیا ہے، کانیں جنگل اور غیر مملوکہ بنجر زمینیں جنگل اور پانی کا شکار، خود رو گھاس، دریا اور سمندر، مالِ غنیمت وغیرہ یہ تمام پیدائش دولت کے اوّلیں ماخذ ہیں، اور ان میں ہر فرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان سے اپنے کسب و عمل کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اس پر کسی کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ؎	تاکہ (یہ دولت) تم میں سے (صرف) مالداروں کے درمیان دائر ہو کر نہ رہ جائے۔

اس کے بعد جہاں انسانی عمل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور کوئی شخص اپنے کسب و عمل سے کوئی دولت حاصل کرتا ہے تو وہاں اس کے کسب و عمل کا احترام کر کے اسکی ملکیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اور اس میں ہر ایک کو اس کے کسب و عمل کے مطابق حصہ دیا گیا ہے۔ اور اس معاملے میں ارشاد یہ ہے کہ:

نحن قسمنا بینھم معیشتھم ورفعنا بعضھم فوق بعضٍ درجات لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا۔ ...	ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات کی فوقیت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے کام لے سکے۔

لیکن درجات کے اس فرق کے باوجود کچھ ایسے احکام دیدئے گئے ہیں کہ یہ فرق اس قدر رہے جتنا ایک قابلِ عمل نظم معیشت کے قیام کے لئے ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دولت کا ذخیرہ صرف چند ہاتھوں میں سمٹ رہے۔

تقسیم دولت کے ان تین مقاصد میں سے پہلا مقصد اسلامی معیشت کو اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے۔ تیسرا مقصد سرمایہ دارانہ نظام سے اور دوسرا دونوں سے جس کی تفصیل عنقریب عرض کی جائے گی۔

اسلامی نظم معیشت کے ان چند بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب میں مختصراً

؎ واضح رہے کہ یہ آیت مال غنیمت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جو حصول دولت کے اوّلین ماخذ میں سے ہے۔

تقسیم دولت کا وہ نظام بیان کرنے کی کوشش کروں گا جو قرآن و سنت اور فقہاء امت کی کاوشوں سے سمجھ میں آتا ہے۔

تقسیم دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ | اسے پوری طرح سمجھنے کیلئے سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں "تقسیم دولت" کا جو نظام مقرر کیا گیا ہے پہلے اس پہ ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔ مختصر لفظوں میں اس نظریئے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دولت انہی لوگوں پر تقسیم ہونی چاہئے جنہوں نے اسکی پیداوار میں حصہ لیا ہے۔ اور جنہیں معاشی اصطلاح کے مطابق "عاملین پیداوار" کہا جاتا ہے۔
سرمایہ دارانہ معاشیات میں یہ کل چار عوامل ہیں۔

۱۔ سرمایہ ــــــ جسکی تعریف "پیداکردہ ذریعہ پیدائش" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ شئے جس پہ ایک مرتبہ انسانی عمل پیدائش ہو چکا ہو۔ اور اسے ایک دوسرے عمل پیدائش کے لئے ذریعہ بنایا جا رہا ہو۔

۲۔ محنت ــــــ یعنی انسانی عمل۔

۳۔ زمین ــــــ جس کی تعریف "قدرتی وسائل" سے کی گئی ہے۔ یعنی وہ اشیاء جو انسان کے کسی سابقہ عمل پیدائش کے بغیر پیدائش کا وسیلہ بن رہی ہوں۔

۴۔ آجر یا منتظم، یعنی وہ چوتھا عامل جو مذکورہ بالا تینوں عوامل کو جوڑ کر انہیں کام میں لگاتا اور نفع و نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ان چار عاملین پیداوار کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوتی ہے۔ اسکو انہی چاروں پہ اسطرح تقسیم کیا جاتا ہے کہ ایک حصہ سرمایہ کو سود کی شکل میں دیا جاتا ہے، دوسرا حصہ محنت کو اجرت کی شکل میں دیا جاتا ہے۔ تیسرا حصہ زمین کو لگان یا کرایہ کی صورت میں ملتا ہے۔ اور چوتھا حصہ آجر کے لئے منافع کی صورت میں باقی رکھا جاتا ہے۔

تقسیم دولت کا اشتراکی نظریہ | اس کے برخلاف اشتراکی معیشت میں چونکہ سرمایہ اور زمین کسی کی انفرادی ملکیت ہونے کی بجائے قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس لئے سود اور لگان کا اس نظام کے فلسفے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[1] آجر بھی اشتراکی نظام میں کوئی فرد واحد ہونے کی بجائے

---

[1] یہاں یہ واضح رہے کہ اس وقت گفتگو اشتراکیت کے اصل فلسفے سے ہو رہی ہے اس کے موجودہ عمل سے نہیں۔ اشتراکی ممالک کا موجودہ طرز عمل اس فلسفے سے بہت مختلف ہے۔

خود حکومت ہوتی ہے، اس لئے منافع بھی اس کے یہاں نظری طور پر خارج از بحث ہے۔ اب صرف "محنت" رہ جاتی ہے۔ اور اشتراکی نظام میں دولت کی وہی مستحق ہے جو اسے "اجرت" کی شکل میں ملتی ہے۔

تقسیم دولت کا اسلامی نظریہ | اسلام کا نظام تقسیم دولت ان دونوں سے مختلف ہے اس کے نزدیک دولت کے مستحقین دو قسم کے ہیں۔ ایک اوّلین مستحق، یعنی وہ لوگ جو کسی عمل پیدائش کے بعد بلاواسطہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ یہ مستحقین وہی عوامل پیداوار ہیں جنہوں نے کسی پیداوار کے عمل پیدائش میں حصہ لیا۔ دوسرے ثانوی مستحقین یعنی وہ لوگ جو براہ راست عمل پیدائش میں شریک نہیں تھے۔ لیکن عاملین پیدائش کے ذمے لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی دولت میں ان کو بھی شریک کریں۔ یہاں مستحقین دولت کی ان دونوں قسموں کو ہم قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

دولت کے اوّلین مستحق | جیسا کہ عرض کیا گیا۔ دولت کے اولین مستحق عوامل پیداوار ہوتے ہیں۔ لیکن عوامل پیداوار کی تعیین انکی اصطلاحات اور ان پر تقسیم دولت کے طریقے اسلام میں بعینہ وہ نہیں ہیں جو سرمایہ دارانہ نظم معیشت میں مقرر کئے گئے ہیں۔ بلکہ بہت مختلف ہیں۔ اسلامی نظریئے کے مطابق پیدائش کے حقیقی عوامل چار کی بجائے تین ہیں۔

۱۔ سرمایہ — یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں استعمال اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ انہیں خرچ نہ کیا جائے یا ان کی شکل و صورت میں تبدیلی نہ کی جائے۔ اور اس لئے ان کا کرایہ پر چلانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً نقد روپیہ یا اشیائے خوردنی وغیرہ۔

۲۔ زمین — یعنی وہ وسائل پیداوار جن کا عمل پیدائش میں اسطرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کہ انکی اصلی شکل و صورت برقرار رہتی ہے۔ اور اس لئے انہیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ مثلاً زمین۔ مکان۔ مشینری وغیرہ۔

۳۔ محنت — یعنی انسانی عمل، خواہ وہ اعضاء و جوارح کا ہو، یا ذہن اور قلب کا۔ لہذا اس میں تنظیم اور منصوبہ بندی بھی داخل ہے۔

ان تین عوامل کے مشترکہ عمل سے جو پیداوار ہوگی وہ اولاً انہی تینوں پر اس طرح تقسیم کی جائے گی کہ اس کا ایک حصہ سرمایہ کو بہ شکل منافع (نہ کہ بشکل سود) ملے گا۔ دوسرا حصہ زمین کو بشکل کرایہ دیا جائے گا۔ اور تیسرا حصہ محنت کو بشکل اجرت۔

اشتراکیت اور اسلام | تقسیم دولت کا یہ نظام اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اور

سرمایہ داری سے بھی۔ اشتراکیت سے تو اس کا فرق بالکل ظاہر ہے۔ کہ اشتراکیت میں چونکہ انفرادی ملکیت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے جو اصول ہم نے شروع میں بیان کئے ہیں، ان کی روشنی میں کائنات کی تمام اشیاء اصلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں۔ پھر ان اشیاء میں سے ایک کثیر حصہ تو وہ ہے جسے اس نے وقف عام کے طور پر تمام انسانوں کو مساوی طور پر دے دیا ہے۔ آگ، پانی، مٹی، ہوا، روشنی، خود رو گھاس جنگل اور پانی کا شکار۔ معادن اور غیر مملوک بنجر زمین وغیرہ اس قسم میں داخل ہیں، جن پر کسی کی انفرادی ملکیت نہیں۔ بلکہ وہ وقف عام ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ان کا مساوی طور پر حقدار ہے۔

دوسری طرف بعض اشیاء وہ ہیں جن میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کئے بغیر وہ قابل عمل اور فطری نظم معیشت قائم نہیں ہو سکتا جس کی طرف ہم نے تقسیم دولت کے پہلے مقصد میں اشارہ کیا ہے۔ اشتراکی نظام کو اختیار کرتے ہوئے تمام سرمایہ اور زمین کو کلیتہً حکومت کے حوالے کر دینے کا نتیجہ مآل کار اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ چھوٹے چھوٹے بیشمار سرمایہ داروں کو ختم کر کے ملکی دولت کے عظیم الشان ذخیرے کو ایک بڑے سرمایہ دار کے حوالہ کرنا پڑتا ہے۔ جو من مانے طریقے پر دولت کے اس تالاب سے کھیلتا ہے۔ اور اسطرح اشتراکیت کا نتیجہ بدترین ارتکاز دولت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے دوسری بڑی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ انسانی محنت چونکہ اپنے اختیار اور مرضی کے فطری حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس کے استعمال کیلئے جبر و تشدد ناگزیر ہے جس کا برا اثر محنت کی کارکردگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور اسکی ذہنی صحت پر بھی، اس سے واضح ہو گیا کہ اشتراکی نظام میں اسلامی نظریۂ تقسیم دولت کے دو مقاصد مجروح ہوتے ہیں، ایک فطری نظم معیشت کا قیام اور دوسرے حقدار کو حق پہنچانا۔

غرض اشتراکیت کے غیر فطری نظام کی ان چند در چند خرابیوں کی وجہ سے اسلام نے انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کر ڈالنا پسند نہیں کیا۔ بلکہ کائنات کی جو اشیاء وقف عام نہیں ہیں، ان میں انفرادی ملکیت کو تسلیم کر کے اس نے سرمایہ اور زمین کی جداگانہ حیثیت بھی برقرار رکھی ہے اور ان میں "رسد و طلب" کے فطری نظام کو بھی صحت مند بنا کر استعمال کیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں اشتراکیت کی طرح تقسیم دولت صرف اجرت کی شکل میں نہیں ہوتی، بلکہ منافع اور کرایہ کی صورت

میں بھی ہوتی ہے ۔ لیکن ساتھ ہی اس نے "سود" کی مد کو ختم کر کے اور دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست بنا کر ارتکاز دولت کی اس زبردست خرابی کو بھی ختم کر دیا ہے جو سرمایہ داری کا خاصہ لازمہ ہے ۔ اور جسے دور کرنے کا دعویٰ اشتراکیت کرتی ہے ۔

سرمایہ داری اور اسلام | یہ تھا اسلامی نظریہ تقسیم دولت کا وہ بنیادی فرق جو اسے اشتراکیت سے ممتاز کرتا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی اس فرق کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے جو سرمایہ داری اور اسلام کے نظام تقسیم دولت میں پایا جاتا ہے ۔ یہ فرق چونکہ قدرے دقیق اور پیچیدہ ہے ۔ اس لئے اسے نسبۃً زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہو گی ۔

اوپر ہم نے اسلام اور سرمایہ داری کے نظام تقسیم دولت کے جو اجمالی خاکے پیش کئے ہیں ان کا تقابل کرنے سے اسلام اور سرمایہ داری کے درمیان مندرجہ ذیل فرق واضح ہوتے ہیں :

۱۔ عوامل پیداوار کی فہرست سے آجر کو ختم کر دیا گیا ہے ۔ اور صرف تین عوامل پیداوار تسلیم کئے گئے ہیں ۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ آجر کے وجود سے انکار کیا گیا ہے ۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ کوئی الگ عامل نہیں بلکہ ان تین عوامل میں سے کسی نہ کسی میں شامل ہیں ۔

۲۔ سرمایہ کا صلہ "سود" کی بجائے "منافع" قرار دیا گیا ہے ۔

۳۔ عوامل پیدائش کی تعریفیں بدل دی گئی ہیں ۔ "سرمایہ" کی تعریف سرمایہ دارانہ معیشت میں "پیدا شدہ ذریعہ پیدائش" سے کی جاتی ہے ۔ لہٰذا نقد روپیہ اور اشیائے خوردنی کے علاوہ مشینری وغیرہ بھی اس میں داخل ہے ، لیکن ہم نے اسلامی نظریہ تقسیم دولت کی توضیح کرتے ہوئے "سرمایہ" کی جو تعریف بیان کی ہے اس میں صرف وہ چیزیں شامل ہیں جنہیں خرچ کئے بغیر ان سے استفادہ ممکن نہیں ، یا بالفاظ دیگر جنہیں کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا ۔ مثلاً روپیہ ۔ لہٰذا مشینری اس تعریف کی رو سے "سرمایہ" میں داخل نہیں ۔

۴۔ اسی طرح "زمین" کی تعریف زیادہ عام کر دی گئی ہے ۔ یعنی اس میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے جن سے استفادہ کے لئے انہیں خرچ کرنا نہیں پڑتا ۔ لہٰذا مشینری بھی اس میں داخل ہو گئی ہے ۔

۵۔ محنت کی تعریف میں بھی زیادہ عموم پیدا کر دیا گیا ہے ۔ لہٰذا اس میں ذہنی محنت اور منصوبہ بندی بھی شامل ہو گئی ہے ۔

(باقی آئندہ)

مغربی مستشرقین اور انکی تحقیقات کا اثر

تجدّد اور مغربیّت کا پس منظر

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی

★

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح وترقی (درحقیقت تجدّد ومغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے اُن کے خیالات، اصلاحات اور اُن کے طریقہ کار میں مستشرقین کی اس دعوت وتلقین کا عکس صاف نظر آئے گا، یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین وزعماء کے فکر وعمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اسکو ان کا مشترک منشور (MANIFESTO) کہا جاسکتا ہے۔

موجودہ عالم اسلام کے رہنما وحکمران طبقہ کے (جس نے عام طور پر اعلیٰ مغربی تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی ہے، یا مغربی زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے) دماغوں میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی، اسلام وپیغمبر اسلام اور اسلامی مآخذ (SOURCES) کے بارہ میں شکوک وشبہات پیدا کرنے اور "اصلاحِ مذہب"، "اصلاح قانونِ اسلامی" پر آمادہ کرنے میں بہت بڑا حصہ اُن علماء مغرب کا ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کیلئے اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین (ORIENTALIST) کہا جاتا ہے اور جو اپنے علمی تبحر، تحقیقی انہماک اور مشرقیات سے گہری واقفیت کی بنا پر مغرب و مشرق کے علمی وسیاسی حلقوں میں بڑی عظمت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور اُن مشرقی اسلامی مباحث ومسائل میں اُن کی تحقیق ونظریات کو حرفِ آخر اور قولِ فیصل سمجھا جاتا ہے۔

اس استشراق کی تاریخ بہت پرانی ہے، وہ واضح طریقہ پر تیرھویں صدی مسیحی سے شروع ہوجاتی ہے، اس کے محرکات دینی بھی تھے، سیاسی بھی، اقتصادی بھی، دینی محرک واضح ہے،

اس کا بڑا مقصد مذہب عیسوی کی اشاعت و تبلیغ اور اسلام کی ایسی تصویر پیش کرنا ہے کہ مسیحیت کی برتری اور ترجیح خود بخود ثابت ہو اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل کے لئے مسیحیت میں کشش پیدا ہو، چنانچہ اکثر استشراق اور تبلیغ مسیحیت ساتھ ساتھ چلتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے، اُن میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً و مذہباً یہودی ہے۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ یہ مستشرقین عام طور پر مشرق میں مغربی حکومتوں اور اقتدار کا ہراول دستہ (PIONEERS) رہے ہیں، مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے، وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق ماند و بود اور زبان و ادب، بلکہ جذبات و نفسیات کے متعلق صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ تاکہ اُن پر اہلِ مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو، اسی کے ساتھ ساتھ ان حالات و تحریکات، عقائد و خیالات کا "توڑ" کرتے رہتے ہیں۔ جو ان حکومتوں کے لئے پریشانی اور دردسر کا باعث ہیں، اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ان حکومتوں کی مخالفت کا خیال ہی پیدا نہ ہونے پائے، اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقشِ قدم پر چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے ہٹ جانے پر بھی اُن کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا اور اُن کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی، اور اسی مقصد کے ماتحت مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں۔ جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ "شرق اوسط" (JOURNAL OF NEAR EAST) امریکہ سے ـــــ اور مجلہ "عالم اسلامی" (THE MUSLIM WORLD) (LEMONDE MUSALMANS) فرانس سے نکل رہے ہیں۔

ان اہم مذہبی و سیاسی محرکات کے علاوہ قدرتی طور پر استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے، بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب پیشہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں، بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں، یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے۔ اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں۔ اور بڑی سرعت کے ساتھ یورپ و امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں، جو بہت بڑی مالی منفعت اور کاروبار کی ترقی

کا ذریعہ ہیں۔

ان مقاصد کے علاوہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فضلا مشرقیات و اسلامیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے ماتحت ہی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لئے اس دیدہ ریزی دماغ سوزی اور جفاکشی سے کام لیتے ہیں جس کی داد نہ دینا ایک اخلاقی کوتاہی اور علمی ناانصافی ہے، ان کی مساعی سے بہت سے مشرقی و اسلامی علمی جواہرات و نوادر پردۂ خفا سے نکل کر منظر عام پر آئے اور جاہل وارثوں اور ظالم کیڑوں کی دست برد سے محفوظ ہو گئے۔ متعدد اعلیٰ اسلامی مآخذ اور تاریخی وثائق ہیں جو ان کی محنت و ہمت سے پہلی مرتبہ شائع ہوئے[1] اور مشرق کے اہل علم نے اپنی آنکھوں کو ان سے روشن کیا۔

اس علمی اعتراف کے باوجود اس کے کہنے میں باک نہیں کہ مستشرقین عمومی طور پر اہل علم کا وہ بدقسمت اور بے توفیق گروہ ہے جس نے قرآن و حدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آیا، بلکہ اس سے اس کا عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ اور بڑھ گیا؛ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں، عام طور پر ان مستشرقین کا مقصد کمزوریوں کا تلاش کرنا اور دینی یا سیاسی مقاصد کے ماتحت ان کو نمایاں کرنا اور چمکانا ہوتا ہے، چنانچہ صفائی کے انسپکٹر کی طرح ان کو ایک گلزار و جنت نشان شہر میں صرف غیر صحتمند مقامات ہی نظر آتے ہیں۔

مستشرقین کی محرومی صرف انکی ذات تک محدود نہیں، اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو وہ ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری اس بحث کا موضوع نہ ہوتا، مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول و غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت مہیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں، وہ خوردبین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دوربین سے دکھاتے ہیں، رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اپنے اس کام میں (یعنی اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں) اس سبک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جسکی نظیر ملنی مشکل ہے۔ وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں۔ اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لئے ہر طرح کے رطب و یابس، مذہب و تاریخ

---

[1] طبقات ابن سعد، تاریخ طبری، تاریخ کامل ابن اثیر، انساب سمعانی، فتوح البلدان بلاذری، کتاب الہند البیرونی وغیرہ پہلی مرتبہ یورپ سے شائع ہوئیں پھر ان کے متعدد ایڈیشن مصر سے نکلے۔

ادب، افسانہ، شاعری، مستند وغیر مستند ذخیرہ سے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی ہو (خواہ وہ صحت و استناد کے اعتبار سے کتنا ہی مجروح و مشکوک اور بے قیمت ہو) اس کو بڑے آب و تاب سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس متفرق مواد سے ایک نظریہ کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف اُن کے ذہن میں ہوتا ہے، وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں۔ اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لئے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن اُن کے انصاف، وسعت قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک بُرائی کو (جو تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے) قبول کرے، وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول، تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز سے کھینچتے ہیں (خواہ وہ محض خیالی ہو) کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردعمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔ اور اسکی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر بن جاتا ہے، اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں "زہر" کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں۔ اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کردے، ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔

قرآن، سیرت نبوی، فقہ و کلام، صحابۂ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہا، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین حدیث، فقہ اسلامی کے مآخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہرائی نظر نہ رکھتا ہو، پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لئے کافی ہے، اس کا علمی جائزہ لینا، ان کی تحریفات، فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے، یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے، جس کے لئے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔

یہاں ہم نہایت اختصار کے ساتھ اُن کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول

کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی "اصلاح و ترقی" کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں، جو ایک مصری فاضل (ڈاکٹر محمد البھیؒ) نے اپنی فاضلانہ کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے۔ اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

"—— اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی، یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت میں تھا، اس ابتدائی حالت اور دورِ طفولیت نے اس کا موقع دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے، لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا۔ کلچرل، سیاسی، اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی، اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا، یہ خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ خلافتِ اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا۔ اور اب اسکی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لئے اس کا اظہار کر سکیگا۔[1]

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا، اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے۔ روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا، اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدنِ جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے۔ جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے، یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے، اس لئے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔[2]"

---

[1] سابق ڈائرکٹر شعبہ ثقافت اسلامی حکومت مصر و حال وزیر اوقاف جمہوریہ عربیہ متحدہ۔

[2] الفکر الاسلامی الحدیث صفحہ ۱۸۱ صفحہ ۱۸۲ [3] الفکر الاسلامی الحدیث صفحہ ۱۸۲

تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں، مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہیئے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پاسکیں، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں، ملتِ اسلامی کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار (IDEAL) کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہلِ مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں، اہلِ مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹفک طریقہ استعمال کیا، یہ طریقہ اوہام و خرافات اور مخصوص عقائد سے متاثر نہیں ہوتا، اس کے پیشِ نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے[1]۔۔۔۔"

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جد و جہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا، اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید ردِ عمل اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطۂ نظر سے خطرناک تھا، وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے، اب ان نتائج کی روشنی میں انہوں نے طے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیئے، اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاحِ مذہب (REFORM) کی تحریک چلانی چاہیئے اور جہاں جہاں تجدد و اصلاحِ مذہب کی تحریک چل رہی ہے۔ اسکی ہمت افزائی اور تائید کرنی چاہیئے، اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشاندہی ہوتی ہے، HARRY GAYLORD DORMAN اپنی کتاب TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM میں لکھتا ہے:۔

"۔۔۔۔ اصلاحی تحریکیں، دینی تعلیمات کی موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سرِ نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس لئے وہ (مسیحیت کے) ایک مبلغ کے لئے اوّلین اہمیت

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث ص۱۹۲

رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کچھ خبطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے، ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھیلتی جارہی ہیں اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے نبرد آزما ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر بڑی اہم ثابت ہو، حتیٰ کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آیندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح واحیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید واحیاء ہو۔ بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی، یہ میدان کھلا ہوا ہے، یہ ان معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔[2] "

اس نصف صدی کے اندر عالم اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوئے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقۂ کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا، یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین وزعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے۔ اور اس کو ان کا مشترک منشور MANIFESTO کہا جاسکتا ہے۔

ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑ جائے اور وہ اسلام کے بارے میں متشکک ہوجائے، کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے، ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت و دقیانوسیت

---

[1] یہ تجدید واحیاء ظاہر ہے کہ ان مستشرقین کے اصول و معیار کے مطابق ہی ہوگا اور یہ درحقیقت تجدید کے بجائے تحریف و تجدد کا عمل ہے جو تقریباً تمام اسلامی ممالک میں شروع ہوگیا ہے۔

HARRY GAYLORD DORMAN: TOWARDS UNDERSTANDING ISLAM P.125 ——— [2]

کا مرادف قرار دیا، دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیت قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا، چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردانِ رشید کے ذریعہ مصر میں "فرعونی"، عراق میں "آشوری"، شمالی افریقہ میں "بربری"، فلسطین و لبنان کے ساحل پر "فنیقی" تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کے مستقل داعی پیدا ہو گئے: انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شد و مد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی زبان "فصحیٰ" اس زمانہ کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اس کے بجائے عامی (COLLOQUIAL) اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیئے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیئے، یہ بات انہوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنے بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی[1] جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہو جائے۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عرب قوموں کا رشتہ کٹ جائے اور وہ ان کے لئے ایک اجنبی زبان بن جائے، عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کر دے اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور روح سے محروم ہو کر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کے نذر ہو جائیں۔

اسی طرح انہوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط (ROMAN CHARACTER) کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کئے، اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہو جائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بیکار ہو کر رہ جائے۔

ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات، ان کی دور بینی اور ان کی

---

[1] سلامہ موسیٰ اس تحریک کا خاص علمبردار تھا، محمد حسین ہیکل، احمد امین اور احمد حسن الزیات بھی جزوی طور پر اس کے حامی تھے۔

اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے، ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں؛ اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث وفقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں، مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکک وارتیاب پیدا کرتی ہیں، اسلام کے حاملین وشارحین (محدثین وفقہاء) کی علمیت ودیانت کی طرف سے تشکک بناتی ہیں، فاحش علمی غلطیوں، مضحکہ خیز غلط فہمیوں، زبان وقواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان کی اکثر وبیشتر تصنیفات مغربی ومشرقی دنیا میں مقبول ہیں، نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہل علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال، نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹفک) طریقہ سے مرعوب ومسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علمائے مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی، مغربی علمائے مستشرقیات جس وقعت واعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور انہوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کر لیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مشرق وسطی کی تینوں موقر مجالس علمیہ (ACADEMIES) المجمع اللغوی (مصر) المجمع العلمی العربی (شام) المجمع اللغوی العراقی (بغداد) میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور ان کے مطالعہ وآراء سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مائگی وکم ہمتی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خالص اسلامی وعربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر دارومدار ہے۔ اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس (GOSPEL) کی حیثیت رکھتی ہیں، تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن (R.A. NICHOLSON) کی کتاب A LITERARY HISTORY، تاریخ عرب واسلام پر ڈاکٹر ہٹی (P.H. HITTI) کی کتاب HISTORY OF ARABS تاریخ ادبیات اسلامیہ پر بروکلمان (CARL BROCKLEMANN) کی کتاب (GESCHICHTIS DER ARABISHEN LITRATURE) جرمن میں اور اس کا انگریزی ترجمہ (THE HISTORY OF ARAB LITRATURE) اسلامی قانون پر شاخت (SCHACHT) کی کتاب (THE ORIGINS OF MOHAMMADANS JURISPRUDENCE) اپنے اپنے موضوع پر منفرد سمجھی جاتی ہے اور بیشتر مشرقی جامعات میں شعبہ عربی واسلامیات میں ان کی حیثیت ایک علمی مرجع (REFERECE BOOK) اور سند (AUTHORITY) کی ہے۔ مستشرقین کا مرتب کیا ہوا دائرۃ المعارف الاسلامیہ (ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM) جس کے متعدد ایڈیشن یورپ و امریکہ سے نکل چکے ہیں اور جس میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے اسلامی معلومات وحقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے اور مصر وپاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی وتشکیکی اثرات کو رد کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین واہل نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں، مستند ومعتمد اسلامی معلومات اور نقطۂ نظر پیش کریں، یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت (ORIGINALITY) مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمق، مآخذ کے استناد وصحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق وممتاز ہوں، ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں، اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں، دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے، متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ واخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے، ان کے مآخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے، اور ان کی دعوت وتلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں ان کو طشت ازبام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔

اس پہلے مثبت وایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی وجوابی جزو (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین وحوصلہ مند طبقہ جو یورپ وامریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے۔ اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے۔) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، مستشرقین کے زہر آلود خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا، اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہو اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرہ سے دوچار رہیں گے اور ان ممالک میں تجدد ومغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہیں اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل وقومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے، اور جس کا رُخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا۔ اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلام کے اہل فضلاء اور رہنماؤں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ؂

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

قرآنِ حکیم ___ اور ___ تعمیرِ اخلاق

(سمیع الحق)

★

یہ مقالہ تعلیم القرآن سوسائٹی ڈھاکہ کے زیرِ اہتمام منعقد شدہ کانفرنس (۲۳،۲۴-۲۵ فروری ۱۹۶۸ء) کیلئے لکھا گیا

۲۳،۲۴-۲۵ فروری کو ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں تعلیم القرآن سوسائٹی کے زیرِ اہتمام قرآن کریم پر ایک سیمینار ہوا جس میں ممتاز علماء و مشائخ نے شمولیت کی اور قرآنی تعلیمات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ دارالعلوم حقانیہ سے اس اجتماع میں شمولیت کیلئے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ اور مولانا سمیع الحق مدیر ماہنامہ الحق ۲۲ر فروری ۱۹۶۸ء کو تشریف لے گئے۔ مدیر الحق نے یہ مقالہ اس سیمینار کیلئے لکھا جسے ہم بالاقساط پیش کریں گے۔ ___ اصغر حسن ___

خداوندکریم انسان کو اپنا خلیفہ اور خلاصۂ کائنات کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ اسکی سرشت میں ظلمت و نور، خیر و شر، نیکی اور بدی کی متضاد صفات ودیعت کی گئی ہیں، وہ اگر چاہے تو ان متضاد صفات کے ذریعہ تمام مخلوقات سے افضل اور برتر ہوسکتا ہے۔ اور اگر چاہے تو تمام خلاقی اور مادی عناصر سے بدتر ہو جاتے۔ صفاتِ خیر غالب ہونے کی صورت میں وہ لقد کرمنا بنی آدم وحملناہ فی البر والبحر کا مصداق ہے۔ اور صفاتِ شر غالب ہونے کی شکل میں اولٰئک کالانعام بل ہم اضل اور ثم رددناہ اسفل سافلین کی بناء پر روئے زمین کی سب سے بدتر اور مبغوض مخلوق قرار پا جاتا ہے۔ خداوندکریم کی وہ امانت جس کے اٹھانے سے تمام کائنات عاجز رہی خداوندکریم نے انسان کو اس امانت کا حامل قرار دیا اس امانت کے کچھ تقاضے ہیں اور قرآن کریم انسان سے ان تقاضوں کی تکمیل اور اسکی پیدائش سے لیکر وفات تک اس بار امانت کے سنبھالنے کا مطالبہ کرتا ہے ___ زندگی کے اس مختصر وقفہ میں اسے خالق کائنات کے علاوہ دنیا کی ہر شئے سے کچھ نہ کچھ واسطہ پڑتا ہے جس میں

ہم جنس بنی نوع انسان، ماں باپ، اہل وعیال، حاکم اور رعایا، دوست و دشمن، ملک و وطن، قبیلہ اور گاؤں، قومیت اور جنسیت یہاں تک کہ حیوانات تک سے مختلف نوع کے روابط اور تعلقات شامل ہیں۔ اس کے ذمہ کچھ حقوق ہیں، کچھ فرائض۔ خالق اور مخلوق کے ساتھ اس تعلق کو حسن وخوبی سے نبھانا اور خدا کی دی ہوئی تمام صلاحیتوں اور امانتوں کو اپنے موقعہ اور محل میں بہترین طریقہ سے خرچ کرنا حسن اخلاق کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے "حسن خلق" کا لفظ اتنا وسیع مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے جس میں اعمال صالحہ اور اوصاف حسنہ کے ساتھ اعتقادات اور عبادات کی تمام تفصیلات بھی آجاتی ہیں اور قرآن کریم کی تعلیمات اور انسانی اخلاق کے سب سے بڑے معلم خاتم النبیینؐ کی سیرت و کردار کا کوئی گوشہ ایسا نہیں رہتا جسمیں قولی یا عملی طور پر انسان کی تعمیر اخلاق، تہذیب نفس اور تشکیل سیرت کا پہلو نہ پایا جاتا ہو۔ تعمیر اخلاق کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے اس گہرے اور ہمہ گیر تعلق کے ساتھ جب قرآن کریم اور سیرت نبویؐ کی جامعیت بھی ملحوظ رہے تو دعوٰی سے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے کسی مذہب کسی اخلاقی فلسفے اور اصلاحی تحریک کسی ریفارمر اور مصلح کی تعلیمات اور ہدایات میں اخلاق حسنہ کا اتنا اہتمام نہیں جتنا قرآن کریم کی تعلیمات میں ہے اور یہ کہ اسلام اس معاملہ میں بھی یکتا منفرد اور خاتم الادیان ہے۔ خود حضورؐ نے تعمیر اخلاق کے سلسلہ میں اسلام کی اس تکمیلی اور امتیازی حیثیت کو اشارہ فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق[1] میری بعثت کا مقصد ہی اخلاق حسنہ کی تکمیل ہے۔

حضورؐ نے جس جامعیت اور خوبی کے ساتھ اخلاق حسنہ کی تکمیل فرمائی۔ قرآن کریم اول تا آخر اس اجمال کی تفصیل اور اس متن کی تشریح ہے۔ اس بناء پہ حضرت عائشہؓ نے پورے قرآن مجید کو حضورؐ کا اخلاق قرار دیا:

وکان خلقہ القرآن حضورؐ کے اخلاق تو قرآن ہی میں ہیں۔

قرآن کریم اپنی تمام تعلیمات، اوامر اور نواہی، دین اور شریعت کا مقصد ہی انسان کی تکمیل، اور رذائل نفسانی سے اسکی تطہیر اور تزکیہ قرار دیتا ہے۔

ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج ولکن یرید لیطھرکم ولیتم نعمتہ علیکم ولعلکم تشکرون۔

اللہ تعالیٰ تمہیں تنگی میں نہیں ڈالنا چاہتا بلکہ تمہیں پاک صاف کرنا اور اپنی نعمت پوری بھیجنا چاہتا ہے اور یہ کہ تم شکر کرو۔

یہ تطہیر جسے کبھی وہ تزکیہ کا نام دیتا ہے، یعنی نفس کا، تمام ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک و

---

[1] مسند احمد بیہقی وغیرہ

صاف رکھنا قرآن کریم کے الفاظ میں فلاح دارین کا ذریعہ سرخروئی آخرت کا وسیلہ ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

قد افلح من زکّھا وقد خاب من دسّھا ونفس وما سوّٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔ [1]

قسم ہے نفس کی اور جیسا کہ اس کو ٹھیک کر دیا پھر اسکو اسکی نیکی اور بدی سمجھا دی۔ بیشک جس نے اپنے نفس کو پاک کر دیا وہ کامیاب و کامران ہوا اور جس نے اسے آلائشوں میں ڈال دیا وہ خائب اور ناکام رہا۔

قد افلح من تزکّٰی وذکر اسم ربّہ فصلّٰی [2]

بیشک کامیاب ہوا جس نے اپنے آپ کو پاک صاف کیا۔ اور اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھی۔

وہ نفس کو اسکی خواہشات اور آلائشوں سے بچانے والوں اور اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنے والوں کو پر مسرت زندگی کا مژدہ سناتا ہے۔

فامّا من اعطٰی واتقٰی وصدّق بالحسنٰی فسنیسرہٗ للیسرٰی وامّا من بخل واستغنٰی وکذّب بالحسنٰی فسنیسرہٗ للعسرٰی فاما من خاف مقام ... ونھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی الماوٰی۔

اور جس نے دیا اور اللہ سے ڈرتا رہا اور اچھی باتوں کو سچ جانا تو اس کو آسانی میں پہنچا دیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پرواہ رہا اور اچھی بات کو برا جانا تو ہم اسے سختی میں پہنچا دیں گے اور جو کوئی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہو اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا ہو تو بہشت ہی اس کا ٹھکانا ہے۔

قرآن کریم نفس کے اس تزکیہ اور تطہیر، اخلاق حسنہ کی تعمیر، تعلیم اور خبائث سے روکنے کو حضور نبی آخر الزماںؐ کی بعثت کا مقصد قرار دیتا ہے ـــ جا بجا آنحضرتؐ کی تعریف میں کہتا ہے:

(الف) یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبٰت ویحرّم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم

نبی لوگوں کو نیک باتوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ پاکیزہ چیزوں کو لوگوں کے لئے اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے اور وہ بوجھ اور طوق ان سے اتارتا ہے جو ان پر پچھلے زمانہ میں لادے گئے تھے۔

(ب) ویزکّیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔

اور حضورؐ ان ان پڑھوں کو پاک و صاف کرتے ہیں اور ان کو کتاب و حکمت کی تلقین کرتے ہیں۔

---

[1] سورۃ والشمس [2] اعلیٰ

پیغمبرِ اسلام اپنی سیرت کے ذریعہ اور کتاب وحکمت کی تعلیمات سے نفوسِ انسانیہ کی تعمیر وتہذیب کرتا ہے اور جسطرح کتاب ربانی اخلاقِ حسنہ کی جامع ترین کتاب ہے۔ اسی طرح یہ حکمت نبوی بھی، اخلاقِ فاضلہ کا سرچشمہ ہے۔ اس وجہ سے قرآن کریم جا بجا حکمت کے بعد اخلاقِ حسنہ کا ذکر کرتا ہے۔ پھر قرآن کریم اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اخلاقِ حسنہ کی عظمت اور اہمیت کا احساس دلانے کیلئے کہیں اسے ایمان اور اسلام کا نام دیتا ہے، کہیں تقویٰ اور خشیت کا، اور کبھی اسے عبدیت کا شعار اور رحمان کے بندوں کی علامت قرار دیتا ہے۔

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون والذین ھم عن اللغو معرضون۔ (الآیۃ)	بیشک کامیاب ہوئے ایمان لانے والے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں اور برائیوں سے اعراض کرتے ہیں۔
لیس البران تولوا وجوھکم (الی قولہ) اولئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون۔	نیکی صرف اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرتے میں نہیں (بلکہ ایمان اور اخلاقِ حسنہ کا اختیار کرنا بھی نیکی ہے) ایسے لوگ سچے اور پرہیزگار ہیں۔
وعباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا۔ (الی قولہ) واجعلنا للمتقین اماما۔	خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں۔ اور جنکی دعا یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دے۔

پھر وہ صرف اخلاقِ حسنہ کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ پوری شدت کے ساتھ ہمیں رذائل اخلاق اور اس کے عواقب پر بھی متنبہ کرتا جاتا ہے اور کہیں اسے فحشا، منکر، بغی سے یاد کرتا ہے، کبھی اثم اور فسق کے نام سے اور کبھی اسے مقت یعنی خداوند تعالیٰ اور اس کی تمام مخلوق سے تصادم کا نام دیتا ہے۔

وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی[1]	اور اللہ تمام بے حیائیوں اور قابلِ انکار اور سرکشی کی باتوں سے روکتا ہے۔
انہ کان فاحشۃً ومقتاً وساء سبیلاً۔	بیشک یہ زنا (جو اخلاقی برائی ہے) بڑی بے حیائی نہایت نفرت کی بات اور بہت برا طریقہ ہے۔

برے اخلاق واعمال سے بچانے میں قرآن کریم کو انسان کا ظاہر اور باطن دونوں ملحوظ ہیں اور جوارح واعضاء کے ساتھ وہ قلب وفکر کو بھی پاکیزگی نفس کا پابند بناتا ہے۔

---

[1] اعراف

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن والاثم والبغی بغیر الحق۔ — اے نبی کہہ دیجئے کہ میرا رب فحش اور بے حیائی کی تمام ظاہری اور باطنی باتوں اور گناہ اور سرکشی کو حرام ٹھہراتا ہے۔

احکام اور نواہی کے ساتھ ساتھ قرآن کریم آخر تک قصص، امثال اور واقعات امم ماضیہ کے ضمن میں بھی اخلاق فاضلہ کے اچھے ثمرات اور اخلاق سیئہ کے برے نتائج اور عواقب سے خبردار کرتا جاتا ہے۔ خداوند کریم کے ہاں اخلاق فاضلہ کی اہمیت اور برے اخلاق کی نفرت کا اندازہ قرآن کریم کے اولین شارح اور اخلاقیات کے سب سے بڑے معلم سرور کائنات ؐ کے ان ارشادات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا:

اکمل المومنین ایمانا احسنهم خلقا۔ [۱] — مسلمانوں میں کامل ایمان والا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس حدیث میں حسن اخلاق کو ایمان اور اسلام کی تکمیل کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے:

خیارکم احسنکم اخلاقا [۲] — تم میں سے سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ترمذی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ قیامت کے دن اعمال کے ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہو گی۔

ما من شیئ یوضع فی المیزان واثقل من حسن الخلق فان صاحب الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلوٰۃ [۳] — قیامت کے دن میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ رکھی جائے گی۔ صاحب اخلاق شخص اخلاق کی بدولت نمازی اور روزہ دار کا درجہ پا لیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی عطیہ خدا کی طرف سے نہیں ملا ——

خیر ما اعطی الناس خلق حسن۔ [۴] — بہترین نعمت خدا کی نعمتوں میں، اچھے اخلاق ہیں۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی اہمیت ظاہر ہے۔ مگر ایک موقعہ پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ انسان ایمان کے بعد حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور ساری رات عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے [۵]

---

[۱] ترمذی، ابوداؤد، مسند احمد وغیرہ [۲] بخاری کتاب الادب [۳] ترمذی [۴] حاکم، نسائی، ابن ماجہ، طبرانی وغیرہ

[۵] ترمذی۔

ان احبکم الی واقربکم فی الآخرۃ محاسنکم اخلاقاً وان ابغضکم الی وابعدکم منی فی الآخرۃ مساویکم اخلاقاً ـ لہ

تم میں میرے سب سے پیارے اور نزدیک خوش خلق اور سب سے برے اور مجھ سے دور بد اخلاق ہیں ــــ

یہودیت اور تعمیر اخلاق

تعمیر اخلاق میں قرآن حکیم کے حکیمانہ اور جامع اسلوب پر روشنی ڈالنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مذاہب پر ایک تقابلی نگاہ ڈالی جائے ــــ مذاہب عالم میں یہودیت اور عیسائیت دو ایسے مذاہب ہیں جن کا آسمانی ہونا خود قرآن نے بتلایا ہے۔ اور آسمانی ادیان میں یہودیت اس لحاظ سے ممتاز تھی کہ خداوند کریم نے تورات کی شکل میں اسے ہدایت کا ایک بہت بڑا سرمایہ دیا تھا۔ پھر لگاتار بیشمار انبیاء اس شجر ہدایت کی آبیاری کیلئے آتے رہے مگر یہود کا معاملہ ابتدا ہی سے اپنے مذہب کے ساتھ تعنت سرکشی اور اعراض کا رہا ــــ انہوں نے اس نسخہ شفاء کے ذریعہ اصلاح نفس اور ازالہ رذائل کی بجائے اسے اپنی خواہشات کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی اس کی تمام اخلاقی تعلیمات کو بری طرح مسخ ڈالا۔ توحید خالص میں جو اخلاق حسنہ کا سرچشمہ ہے گوسالہ پرستی کی ملاوٹ کی اور اپنی فطری کج روی کی وجہ سے تاویل و تحریف کے راستوں سے اس کی اخلاقی حدود سے فرار کا راستہ نکالا ــــ تعمیر اخلاق کے پہلو سے کسی شریعت کے لانے والے کی سیرت و کردار کا اس کے ماننے والوں پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ آج کی تورات اور بائبل انبیاء کرام کی سیرت کو ایسی گھناؤنی شکل میں پیش کرتی ہے کہ اسے پڑھ کر اخلاق کی رہی سہی وقعت بھی زائل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ خداوند قدوس کی وہ کتاب جسکی تقدیس و تحمید کے ترانے حضرت موسیٰؑ اور دیگر انبیاء بنی اسرائیل کی زبان پر رہے، اسے ایسی فحش گالیوں، بے ہودہ واقعات اور ناشائستہ تعلیمات سے بھر دیا گیا ہے جنہیں بازار کے غنڈے بھی زبان پر نہ لاسکیں۔ ایک ایسی کتاب جسمیں انبیاء پر شراب نوشی یا حرام کاری کے الزامات پائے جائیں، جس میں لوط علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کو معاذاللہ اپنے بیٹوں سے ملوث دکھایا گیا ہو۔ یہاں تک کہ خداوند قدوس کو یعقوب سے رات بھر کشتی لڑتے ہوئے[۲] اور اللہ عزوجل کو پچھاڑتے اور خدا کو زمین و آسمان کی پیدائش پر پچھتاتے[۳] اور روتا دکھایا گیا ہو، ہرگز اپنے پیروؤں کے اخلاق و اعمال کی درستگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ پھر یہود نے تورات کے اخلاق پہلو مسخ کرنے

لہ ابن حنبل، طبرانی، شعب الایمان ۲ـہ تورات پیدائش باب ۳۲ آیت ۲۴ ۳ـہ تورات درس ۵ ۔ ۱

پر بس نہیں کیا بلکہ حضرت عزیر علیہ السلام اور دیگر انبیاء کے بارہ میں عقیدۂ ابنیت اور خود اپنے بارہ میں اللہ تعالیٰ کے محبوب اور اسکی اولاد ہونے کا بیہودہ عقیدہ بھی قائم کر لیا۔

یہ عقیدہ خداوند تعالیٰ کی ذات اور اس کے ساتھ مخلوق کے تعلق کی حیثیت پر ضرب کاری تھا اور بالآخر شرک اور گمراہی، ظلم اور سرکشی، عجب اور غرور، بغض و عناد اور اپنے سے علاوہ دیگر تمام مخلوق کی تحقیر و تذلیل اور اسطرح کی دیگر ہزاروں اخلاقی برائیوں کا باعث بنا۔ خداوند تعالیٰ کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں سوائے خالقیت اور مخلوقیت کے اس کی بارگاہ میں قرب و منزلت کا مدار عمل صالح اور پاکیزہ اخلاق اور عقائد ہیں اور کسی قوم کا بلا کسی دینی اور عملی استحقاق کے اپنے آپ کو خداوند کریم کا منظور نظر اور لاڈلا سمجھنا ایک ایسا شیطانی فریب ہے جو اسے انسانی مجد و شرف کے تمام وسائل اور ذرائع سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ مکافات عمل اور محاسبۂ آخرت کا احساس ختم ہو جانے کے بعد کسی روحانی اور اخلاقی ضابطے کی وقعت دل میں باقی نہیں رہ سکتی اور انسان ایک بے لگام حیوان بن کر رہ جاتا ہے۔ یہود کے اس باطل زعم نے انہیں ایک ایسے عجب و غرور میں مبتلا کر دیا، کہ وہ اپنے سے علاوہ تمام اقوام عالم کو حقیر اور بے وقعت سمجھنے لگے اور تمام خیر و بھلائی کے اکیلے حقدار کہلانے لگے جس کے نتیجہ میں ایک الہامی مذہب طبقاتی کشمکش اور بربریت کا شکار ہو کر رہ گیا اس پندار اور جاہلی تفاخر نیا پھر یہودی مذہب کے مخصوص اور وقتی حیثیت کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ یہود نے اپنے مذہب کو ایک قومی و نسلی مذہب قرار دیکر ساری دنیا پر اسکی راہیں بند کر دیں ایک ایسے تنگ اور گوشہ گیر مذہب سے تعمیر اخلاق اور مذہب انسانیت کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی ہے جو مال و دولت اور مادی مقاصد کے لئے تو اقوام عالم کا خون چوس سکتا ہو، مگر مغفرت خداوندی، جنت اور مغفرت انبیاء سے نسبت اور تعلق بلکہ خدا سے قرابت داری تک کو اپنے لئے الاٹ کرا کر خدا کے نازل کردہ دین کو ایک ہی کنبہ اسرائیلی خاندان کے لئے مخصوص کر دے۔

حضرت موسیٰ کے لائے ہوئے اخلاقی اور روحانی نظام کے ساتھ یہود کے اس تلاعب اور تمسخر کی وجہ سے ان کے تمام قومی اور اخلاقی خصائل ایک خاص سانچہ میں ڈھل گئے جن سے قرآن کریم نے جگہ جگہ پردہ اٹھایا ہے۔ کمزور اور مغلوب ہونے کی شکل میں شجاعت اور بہادری کی بجائے بزدلی ذلت اور خوشامد غالب ہونے کی صورت میں عدل و احسان کی بجائے سنگدلی اور بربریت، مظلوموں کے حقوق مال و جان کی پامالی عام معاملات میں مکر و فریب دغابازی، نقض عہد، نفاق اور حق سے گریز انبیاء سے عداوت خود غرضی اور نفس پروری اور حد سے زیادہ حرص و لالچ، بخل، کنجوسی، خیانت

اور محبت دنیا وغیرہ امور ان کا قومی کردار بن گئے۔

۱۔ فبظلم من الذین هادوا حرمنا علیهم طیبت احلت لهم وبصدهم عن سبیل الله کثیرا واخذهم الربوا وقد نهوا عنه واکلهم اموال الناس بالباطل واعتدنا للکفرین منهم عذابا الیما۔

پس یہود گناہوں کی وجہ سے ہم نے ان پر بہت سی پاک چیزیں حرام کیں جو ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے تھے اور سود لیتے تھے جبکہ انہیں ممانعت کی گئی اور اس وجہ سے کہ وہ ناحق لوگوں کا مال کھاتے تھے جو ان میں سے کافر ہیں ان کے لئے عذاب دردناک تیار کر دیا ہے۔

۲۔ ولتجدنهم احرص الناس علی حیوة ومن الذین اشرکوا یود احدهم لو یعمر الف سنة۔

تو دیکھے گا ان کو مشرکین اور تمام لوگوں سے زیادہ زندگی کا حریص ان میں ہر ایک چاہتا ہے کہ ہزار برس کی زندگی پاوے۔

۳۔ ومنهم من ان تامنه بدینار لا یؤده الیك الا مادمت علیه قائما۔

ان یہود میں سے بعض ایسے ہیں کہ جب تک تو اس کے سر پہ کھڑا نہ رہے تو تیری امانت کی ایک اشرفی بھی واپس نہ کریں۔

۴۔ فبما نقضهم میثاقهم وکفرهم بآیات الله وقتلهم الانبیاء بغیر حق۔

پس ان کو جو سزا ملی ان کی عہد شکنی اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے انکار کرنے اور انبیاء کرام کے قتل کرنے کی وجہ سے ملی۔

اس اخلاقی انحطاط اور اجتماعی مفاسد کے ہوتے ہوئے یہودیت تعمیر اخلاق تو کیا کر سکتی۔ البتہ وہ دنیا کی ہر غیر اخلاقی ہر غیر فطری تحریک اور ہر لادینی نظام کی پشت پناہ اور ہمنوا ثابت ہوئی اور آج اخلاق و اعمال کو تہ وبالا کرنے والی ہر تحریک میں اس کا در پردہ یا علانیہ بھرپور حصہ ہے۔ روس کی خالص لادینی تحریک اشتراکیت کا بانی یہودی تھا اور آج کی مغربی تہذیب و سیاست اور اس کے نتیجہ میں یورپ کا تصور اخلاق سے عاری اور سرمایہ دارانہ نظام جس کی وجہ سے دنیا سودی نظام میں جکڑی ہوئی ہے، یہودی شاطروں کی منت پذیر ہے۔ اور بقول اقبال مرحوم ؎

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود نور حق از سینۂ آدم ربود

قیامت سے قبل فتنۂ دجال کا ظہور اس یہودیانہ ذہنیت کا نقطۂ کمال ہوگا۔ اور روایات سے دجال

کا یہودیت سے رشتہ ثابت ہے۔ خداوند تعالیٰ کی طرف سے اس اخلاقی تنزل کی سزا دائمی ذلت و خسران اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کی طرف سے ان پر لعنت سور اور بندروں کی شکل میں ان کے مسخ ہونے کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

قل هل انبئکم بشر من ذالك	تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں کسی کی بری جزا ہے
مثوبة عند الله من لعنه الله	اللہ کے ہاں وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور
وغضب علیه وجعل منھم القردة	اس پر غضب نازل کیا اور ان میں سے بعض کو
والخنازیر وعبد الطاغوت	بندر کیا اور بعضوں کو سور اور جنہوں نے بندگی کی
اولئك شر مکانا و اضل	شیطان کی وہی لوگ بدتر ہیں اور بہت بہکے
عن سواء السبیل۔	ہوئے سیدھی راہ سے۔
لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل	بنی اسرائیل کے کافر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ
علی لسان داؤد وعیسیٰ بن مریم	کی زبان پر ملعون ہوتے یہ اس لیے کہ وہ نافرمان
ذالك بما عصوا وکانوا یعتدون	تھے اور حد سے بڑھ گئے تھے آپس میں برے
وکانوا لا یتناھون عن منکر	کام کرنے والوں کو منع نہیں کرتے تھے۔ کیا ہی
فعلوہ بئس ما کانوا یفعلون۔	برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔

یہودیت کی اخلاقی اور اعتقادی کوتاہیوں اور یہود کے مزاج قومی اور خصوصیت کے علاوہ تورات کی استنادی حیثیت پر نظر ڈال کر ہمیں اور بھی مایوسی ہو جاتی ہے۔ اسرائیل کے صرف دو اسباط کے بچے کھچے افراد اور تورات کی بخت نصر کے ہاتھوں بربادی پھر ہر سو دو سو سال بعد مسلسل کسی جبار کے ہاتھوں ان کی تباہی پھر خاص طور سے انٹونیس یونانی اور طیطس رومی اور ہڈریں کے ہاتھوں تورات کو دنیا سے ناپید کرنے کی جدوجہد پھر ترجمہ در ترجمہ اور ہر عہد ہر زمانہ کی تحریفات، ظاہر ہے کہ اتنے ان گنت مراحل سے گذرنے والی کتاب تعمیر اخلاق اور تکمیل سیرت کی صلاحیت کب تک برقرار رکھ سکتی جبکہ خدا نے بھی اسکی حفاظت کا بیڑا نہ اٹھایا ہو۔

عیسائیت اور تعمیر اخلاق

اپنے پیش رو یہودیت کی طرح عیسائیت کے پاس بھی نہ تو اصلاح اخلاق اور شائستگی اعمال کا کوئی واضح، معتدل اور فطری نظام ہے اور نہ کوئی مستند، غیر محرف اور جامع اصول و ضوابط ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے متبعین کے ہاتھوں عیسائیت کی اخلاقی تعلیمات کا حلیہ اس طرح بگڑ چکا ہے کہ آج کسی

ہوش وعقل والے کیلئے اس میں جذب وکشش نہیں رہی خود عیسائی قوم اخلاقیات میں اس مذہب کی ناکامی کی معترف ہے، وہ تعصب کی وجہ سے اپنے مذہب کا نام تو لیتی ہے مگر زندگی کی رہنمائی نفس اور معاشرہ کی اصلاح کیلئے اپنے مذہب کی بے بسی دیکھ کر سارے مذاہب سے وہ عقیدتاً بیزار ہو چکی ہے۔ پہلی چیز خداوند کریم پر ایمان اور توحید ہے جو انسان کی علمی وفکری قوتوں کو اعتدال میں رکھتی ہے۔ مگر یہودیت کی طرح عیسائیت کو بھی شرک اور مظاہر پرستی کا جامہ پہنا دیا گیا۔ اقانیم ثلثہ یعنی اللہ روح القدس اور عیسیٰ کو اپنا معبود، تین کو ایک اور ایک کو تین۔ پھر حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا اور حضرت مریم کو خدا کی جورو مان کر انہوں نے اپنے مذہب کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پھر اس کے علاوہ انہوں نے حضرت مسیحؑ کا یہود کے ہاتھوں صلیب ہونے اور "ایلی ایلی لما سبقتنی" کہتے ہوئے زار وقطار رو کر اپنی مدد کیلئے بلانے کا افسانہ گھڑ کر اپنے خدا کو عجیب مجبوری اور بے بسی کے عالم میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ عقیدہ تثلیث ویسے بھی توحید الوہیت کی نفی کر رہا تھا، کہ رہی سہی کسر ۳۱۳ء (بعد از مسیح) سلطنت روما کے قسطنطین کے عیسائیت اپنانے سے پوری ہوئی اس کے ذریعہ قدیم بت پرست رومی تہذیب نے عیسائیت پر احاطہ کر لیا اور بجائے اس کے کہ عیسائیت بت پرستی کو مٹا دیتی اس نے عیسائیت اور بت پرستی میں امتزاج اور یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی اور عیسائی مذہب عیسائیت اور بت پرستی کی معجون بن کر رہ گیا۔[۱]

تعمیر اخلاق اور تہذیب نفس کیلئے دوسری بنیادی چیز عقیدۂ آخرت اور نیکی و بدی کی بنا پر مکافات عمل اور احتساب کا صحیح تصور ہے، کہ خدا کے ہاں سرخروئی کا مدار ہر شخص کے ذاتی اعمال و اخلاق پر ہے۔ نہ تو خدا کے ساتھ کسی کا رشتہ ہے اور نہ ایک شخص کا بوجھ دوسرا اٹھا سکتا ہے۔ خداوند کریم ہر شخص کو گناہوں کی سزا دینے پر قادر ہے۔ وہ کسی کے بدلے دوسرے کو پکڑ کر اسے معاف نہیں کرتا۔ بلکہ ہر شخص کے ساتھ ایک ایک پل کا حساب کریگا۔ مگر عیسائیوں کے ہاتھوں محرّف شدہ مسیحیت میں عقیدۂ آخرت اور محاسبہ اعمال کا بری طرح مذاق اڑایا گیا۔ ایک طرف اپنے زعم باطل میں نحن ابناء اللہ واحباءہ کا عقیدہ جما لیا گیا کہ جب ہم خدا کے پیارے اور رشتہ دار ہیں تو ہم سے بازپرسی اور سختی کہاں ہوگی۔؟ دوسری طرف حضرت عیسیٰؑ کے سولی پر چڑھنے کو اپنے تمام برے اعمال، معاصی اور منکرات کا کفارہ سمجھ لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی بعض عیسائیوں کا یہ تصور کہ صرف ایمان اتنا موثر ہے کہ ایمان لانے کے بعد کوئی گناہ مضر

---

[۱] معرکہ مذہب وسائنس ص ۹۱، ص ۹۲

نہ ہوگا اور نہ خداوند تعالیٰ کسی کا گناہ بخشنے پر قادر ہے۔ ان تصورات کے بعد ظاہر ہے کہ انسان فکر آخرت سے آزاد ہو کر ہر بڑے سے بڑے گناہ پر جری ہو جاتا ہے۔ آج کی مسیحی دنیا کے ہاتھوں پورا عالم جہنم زار بن چکا ہے۔ مگر اس ظلم و بربریت اور حیوانیت کے باوجود اسے کچھ بھی احساس نہیں۔ اس کی حاسۂ انسانیت اور ضمیر مر چکا ہے اور وہ اپنے آپ کو تمام اخلاقی بندھنوں سے آزاد سمجھ رہا ہے۔

رہبانیت اور اخلاق

اس عقیدۂ کفارہ نے آگے چل کر اتنی وسعت اختیار کی کہ ارباب کلیسا جنت کے پروانے اور مغفرت کے قبالے جائداد کی معمولی دستاویزوں کی طرح بیچنے لگے عقیدہ کفارہ، ابنیت مسیح اور ان غلط تصورات کی وجہ سے جب اصلاح نفس اور تزکیہ اخلاق کے میدان میں مسیحی نظام کی بے بسی ثابت ہو چکی تو حضرت عیسیٰؑ کے دو سو سال بعد عیسائی مذہب کے علماء نے اس مقصد کے لئے رہبانیت کے نام سے ایک نیا نظام اور فلسفہ گھڑ لیا جس کے بنیادی اصول بدھ مذہب کے بھکشوؤں، ہندومت کی جوگیت، ایران کی مانویت اور افلاطون و فلاطینوس کی اشراقیت سے ماخوذ تھے۔ اور انہی کو تزکیۂ اخلاق کا وسیلہ قرار دیا گیا ابتداہی سے مسیحیت میں ترک تجرد، دنیوی کاروبار شادی بیاہ، تدبیر منزل اور سیاست مدینہ سے کنارہ کشی اور درویشانہ زندگی اختیار کرنے کو اخلاق کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا تھا۔ یہ تخیلات انجیل میں موجود تھے۔ پھر عیسائیوں کے ساتھ تطہیر اخلاق کا کوئی ہمہ گیر اور جامع مفصل نظام شریعت نہ تھا۔ تنہا انجیل جو اہی کی ستم ظریفیوں کے ہاتھوں تحریف و تلبیس کا شکار ہو کر تفصیلی ہدایت نامہ بننے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ (چنانچہ موجودہ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے ایک وعظ میں صرف دو چار اخلاقی باتیں مذکور ہیں جو ان سے پہلے آسمانی صحیفوں میں منتشر پڑی تھیں)۔ غرض رہبانیت کے نام پر عیسائیت کی جگہ ایک ایسا غیر فطری اور غیر طبعی نظام کھڑا کیا گیا جس میں نہ تو انسان کی فطری خواہشات اور جبلی جبلتوں کا لحاظ رکھا گیا تھا اور نہ دین و دنیا کے باہمی ربط اور فرد و جماعت کے آپس کے تعلقات کا انسان جو فطرتاً مدنی الطبع ہے اسے تمدن اور تہذیب سے کاٹ کر پہاڑوں اور غاروں کی طرف دھکیل دیا گیا اور شدید جسمانی اذیتوں اور جسم کشی کے لرزہ خیز مظاہروں کو عبادت کا نام دیکر اس کی فطری صلاحیتوں کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی گئی اور اس تنگ دنیا اور باہمی علائق، خونی رشتوں اور زندگی سے فرار کو جو در حقیقت وحشت، ظلم، بربریت، نامردی اور بزدلی کہلانے کا مستحق تھا عبادت اور ریاضت اور اخلاق

کا منتہائے کمال ہونے کا نام دیا گیا۔ سینکڑوں سال تک فطرت کے خلاف جنگ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ کتابیں رہبانیت کے اس غلو، افراط، تشدد اور اس کے مہلک اخلاقی اور معاشرتی نتائج کی لرزہ خیز مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

رہبانیت کے اخلاقی نتائج

سینٹ میکیریس سکندر رومی کی بابت مشہور ہے کہ وہ چھ ماہ تک مسلسل ایک غلیظ دلدل میں پڑا رہا اور اس کے برہنہ جسم کو زہریلی مکھیاں ڈستی رہیں ان کا ایک مرید لوہے کا دو دو من وزن اٹھائے پھرتا اور تین سال تک ایک خشک کنوئیں میں پڑا رہا۔ بعض "زاہد" عمر بھر مادر زاد ننگے رہتے اور چوپایوں کی طرح ہاتھ پیر کے بل چلتے ـــــ اس نظام میں جسم کی طہارت اور روح کی بالیدگی کے منافی طریقوں پر اتنا زور دیا جاتا کہ سینٹ اتھینیس نہایت فخر سے اپنے مرشد کے بارہ میں کہتا کہ وہ اس کبر سنی کے باوجود اپنے پاؤں دھونے کے گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ سینٹ ابراہام نے پچاس سال تک اپنے چہرہ پر پانی کی چھینٹ نہ پڑنے دی۔ ایک کانونیٹ کی تیس راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انہوں نے کبھی پاؤں نہیں دھوئے اور غسل کے نام پر تو لرزہ براندام ہوا کرتی تھیں ـــــ

ایک راہب الگزینڈر بڑے تاسف اور حیرت سے کہتا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ ہمارے اسلاف منہ دھونا حرام سمجھتے اور ایک ہم ہیں کہ حمام جایا کرتے ہیں۔ نجاست اور غلاظت کو نفس کی پاکیزگی کا ذریعہ سمجھنے کے ساتھ انسانی بھائی چارہ اور معاشرتی زندگی کو بھی نہایت بیدردی سے پامال کیا گیا۔ اور اس رہبانی طرز معاشرت کے نتیجہ میں خاندانی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور باہمی حقوق، قرابت داری، صلہ رحمی، ہمدردی وغیرہ صفات حسنہ کا خون کیا گیا۔ رہبانیت کے لئے پادری بچوں کو اغوا کرتے، والدین کا اپنی اولاد پر کوئی اختیار نہ رہا اور جو لوگ ایک دفعہ اس زندگی کو اختیار کر لیتے تو عمر بھر ماں باپ اور خویش و اقارب کے چہرہ دیکھنے کو بدترین گناہ اور روحانیت کی بربادی سمجھتے ایک راہب پولاگیس ساہا سال ریاضتوں میں لگا رہا اسکی ماں اس کے فراق میں تڑپتی اور سلگتی رہی۔ مدتوں بعد وہ اپنے بیٹے کو دیکھنے کیلئے پہنچی، بیٹے نے خانقاہ ہی سے ملاقات نہ کرنے کی اطلاع دی۔ ماں نے اسے خطوط بھیجے، اس نے جذبہ رحم سے مغلوب ہونے کے ڈر سے وہ خطوط بغیر پڑھے جلا دیتے۔ اور ماں کے سامنے نہ ہوا۔ اس طرح بہن بھائی اور ماں باپ کے عمر بھر نہ مل سکنے کی بیشمار مثالیں ان راہبوں کی زندگی میں موجود ہیں۔ اس نظام نے ازدواجی

زندگی کو عملاً حرام قرار دیا۔ قوت شہوانی کو پامال کرنے کیلئے جنسی تعلق اور عورتوں سے شادی کو حرام قرار دیکر اسے عفت کا نام دیا گیا اس نظام کا ایک راہب سینٹ جیروم لکھتا ہے۔ کہ "عفت کی کلہاڑی سے ازدواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا راہب کا اولین کام ہے۔"

خوش طبعی، ہنسی مذاق اور مسرت کی تمام کیفیتوں کو گناہ سمجھا گیا لوگ جو شادی شدہ ہوتے راہبانہ زندگی کی خاطر عمر بھر کیلئے بیوی بچوں سے جدا ہو جاتے۔ اگر مرتے وقت بھی بیوی اس کے سرہانے پہنچ جاتی تو نہایت سختی اور نفرت آمیز طریقہ سے اُسے اس کے سامنے سے ہٹا دیا جاتا۔ ایک شخص شوق "ولایت" کے حصول میں خانقاہ پہنچا تو راہبوں نے اس کے عشق و محبت کو آزمانے کیلئے اسے اپنے آٹھ سالہ اکلوتے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے دریا میں پھینکنے پر آمادہ کیا اور اس کے سامنے اس کے بیٹے کو سخت اذیتیں دیں۔ اور جب وہ اس سنگدلانہ طریقوں پر پورا اترا تو اسے راہب بننے کی اجازت دی گئی۔ انسانی فطرت کی خلقی صلاحیتوں اور جبلی خواہشات کو اعتدال میں رکھنے کیلئے اس غیر فطری نامعقول طریقوں کا نتیجہ وہی نکلنا تھا جو عظیم الشان اخلاقی انحطاط اور شرافت و نجابت کے زوال کی شکل میں ظاہر ہوا ۔۔۔ مسیحیت کی پروٹسٹنٹ تحریک اور بالآخر یورپ کی لادینی اور مادی تہذیب اس انسانیت سوز فلسفۂ اخلاق و تعمیر سیرت کا طبعی ردِ عمل ہے بالآخر فطرت انسانی رہبانیت پر غالب ہوئی اور فسق و فجور کا ایک سیلاب اس "اخلاقی نظام" ہی کی بدولت امڈ پڑا۔ اس نظام کے علمبرداروں، پادریوں اور اربابِ کلیسا کی اخلاقی حالت کے بارہ میں قرونِ وسطیٰ کے مصنفین کی شہادتیں پڑھ کر انسان شرم و حیا میں ڈوبنے لگتا ہے۔ خالص مذہبی ادارے، کلیسائیں اور روحانی تقریبات کے مراکز بے حیائی اور فحاشی کے اڈے بن گئے مذہبی عہدہ دار، سود خوار اور راشی ہوتے اور ان کے تعیش کا یہ عالم ہوا کہ مملکت فرانس کی پوری آمدنی بھی ان پاپاؤں کیلئے کافی نہ رہی [1]

اہل کلیسا کی عیاشی کے سامنے امرا اور دنیا داروں کی عیش و عشرت بھی ماند پڑ گئی [2] رہبانیت کے علمبرداروں کی سیرت ٹھیک اس آیت کی تفسیر بن کر رہ گئی۔

ان کثیراً من الاحبار والرھبان	بیشک بہت احبار اور رہبان لوگوں کا مال ناحق
لیأکلون اموال الناس بالباطل	طریقوں سے کھایا کرتے ہیں اور اپنے (ان طریقوں)
ولیصدون عن سبیل اللہ۔	سے لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔

---

[1] مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ص ۲۷۵ [2] معرکہ مذہب و سائنس

تجرد کے نام پر راہبات کی خانقاہیں بداخلاقی کے چکلے بن کر رہ گئے۔ وہاں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام ہونے لگا۔ اس مقصد کیلئے زمین دوز تہ خانے کام میں لائے جاتے۔ محرمات تک سے ناجائز تعلقات اور خلاف وضع فطری جرائم ان خانقاہوں پر چھا گئے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بشپ لکھتا ہے کہ اگر ان خانقاہوں سے حرامی لڑکوں کو الگ کیا جائے تو شاید کوئی بھی خادم لڑکا نہ رہ جائے۔ آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی تک بداخلاقی اور بدکرداری کی یہ داستان اس رہبانیت کی داستان ہے، جسے تطہیر اخلاق کے مقصد سے گھڑ لیا گیا اور جسے نباہا نہ جاسکا۔ "ورھبانیۃ" ابتدعوھا فما رعوھا حق رعایتھا ـــ عیسائیت کی رہبانیت میں تبدیلی اور اس کے اخلاق سوز نتائج سے قطع نظر اگر ہم ایک اور پہلو پہ غور کریں تو پھر بھی یہ حقیقت ثابت ہو جائے گی، کہ عیسائیت قوموں کی تعمیر اخلاق کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ عیسائیوں کا اپنے آپ کو خدا کی اولاد اور احباب سمجھنے کے بعد ظاہر ہے کہ وہ یہودیت اور برہمنیت کی طرح اخلاق و اعمال کا کوئی عالمگیر اور ہمہ گیر تصور پیش نہیں کر سکتے۔ وہ نسلی برتری کو ثابت کرنے کیلئے ایک علاقائی اور نسلی نظریہ حیات ہے۔ گو سیاسی مقاصد اور اقتصادی منافع کے حصول کی غرض سے اسکی مشنریوں کا جال دنیا میں بچھا ہوا ہے۔ آج یورپ میں تعلیم و معاشرت کے میدان میں کالے اور گورے کا امتیازی سلوک اور کالوں پر ظلم و بربریت اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اس مذہب میں عالمگیر نسخہ ہدایت بننے کی کوئی صلاحیت نہیں، مساوات انسانی اور حقوق آزادی و جمہوریت محض زبانی دعوے ہیں۔ پھر وہ مذہب کب عالمگیر اصلاحی دین ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے جس کے پیغمبرؑ نے بار بار اپنی دعوت کی وقتی اور نسلی حیثیت کو ظاہر کر دیا ہو، اور ان الفاظ سے کہ "میں تو اسرائیلی بھیڑوں کو جمع کرنے آیا ہوں اور یہ کہ میرا جانا ہی تمہارے لئے بہتر ہے کہ آنے والا میرے جانے کے بغیر نہیں آئے گا" مکارم اخلاق کے ہمہ گیر آخری نظام پیش کرنے والی شخصیت کی بشارت دی ـــ خود قرآن حکیم نے بھی حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں ورسولاً الی بنی اسرائیل کے الفاظ سے مسیحیت کا بنی اسرائیل تک محدود ہونے کو ظاہر فرمایا ہے۔ اس صورتحال کے بعد انجیلی پروگرام (جو ایک مخصوص قوم اور مخصوص حالات کے مناسب حال اتارا گیا تھا) کب غیر اسرائیلی دنیا کی فلاح و سعادت کا پیغام بن سکتا ہے ـــ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ تعمیر اخلاق میں قرآن حکیم کے ساتھ دیگر مذاہب کا موازنہ کرتے ہوئے ہمارا مقصد ان مذاہب کے انبیاء کرام اور ان کی تعلیمات پر حرف گیری مقصود نہیں۔ ہم تمام انبیاء اور سچے ادیان کی بنیادی تعلیمات کو اعلیٰ انسانی اخلاق اور سچی تعلیمات کا بہترین اور پاکیزہ نسخہ شفا سمجھتے ہیں، بلکہ ہمارا

موازنہ ان مذاہب کی بگڑی ہوئی تحریف شدہ موجودہ تعلیمات سے ہے۔ اور انکی یہ بے اعتدالی، ناقابل عمل اور غیر مفید ہونا، ان کے پیروؤں کی تحریف و تلبیس کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔ اور اپنی موجودہ شکلوں میں انہیں تعمیر اخلاق کیلئے مفید نہیں سمجھتے۔ موجودہ انجیل ابتدا سے لیکر آجتک تحریف و تلبیس، تصحیح و تغلیط، تنقید و تنقیح، اضافہ و ترمیم کے جن عجیب و غریب مراحل سے گذر کر ہم تک پہنچی ہے اور ترجمہ در ترجمہ کی شکل میں تغیر و تبدیلی کا اسے سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی ذی ہوش اور صاحب علم و نظر اسے ہدایت کا ربانی اور آسمانی نسخہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ آج اس کا کوئی اصل نسخہ دنیا میں موجود نہیں۔ حضرت مسیحؑ کے فوراً بعد اس کے سینکڑوں اور ہزاروں مختلف اور متعارض نسخے پھیل گئے۔ پھر مشرقی روم کے ایک شہر نیلیس (فینیقیہ) میں ۳۲۵ء میں قسطنطین کے ایماء پر ایک کونسل نے ان ہزاروں نسخوں سے موجودہ اناجیل اربعہ کا انتخاب جس مضحکہ خیز طریقہ سے کیا اثبات و تحقیق اور اسناد و تاریخ کی دنیا میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ اس کونسل میں شام و عراق سے لیکر جزائر برطانیہ تک سو سے زائد بشپ اور پوپ شریک ہوئے۔ گرجا کے صدر مقام پر تمام مروجہ اناجیل کا ڈھیر لگایا گیا اور پادری سجدہ میں گر کر دعا کرنے لگے کہ "جو جھوٹی ہے سو گر جائے" اتفاق سے اور تمام نسخے گر گئے، صرف چار باقی رہ گئے، جو اناجیل اربعہ کے نام سے دنیا میں پھیلائے گئے۔[1]

ان اناجیل سے بھی تحریف و تلبیس کا جو سلوک کیا گیا، نا ممکن تھا کہ اب بھی خداوند کریم کی سچی تعلیمات محفوظ بنتیں جب خداوند کریم نے قرآن مجید کی طرح اسکی حفاظت و نگہداشت کی ذمہ داری بھی نہیں لی تھی۔ بلکہ خود اسے ایک وقتی اور عارضی مذہب قرار دے چکا تھا۔

مفسر حقانیؒ نے بحوالہ مسٹر مل نقل کیا ہے۔ کہ عہد جدید کے نسخوں کا مقابلہ کیا گیا۔ تو ۳۰ ہزار اختلافات پائے گئے۔ ڈاکٹر گریباخ نے اور زیادہ یعنی ۳۲۵ نسخوں کا مقابلہ کیا تو اختلافات کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تک پہنچی۔ پادری فنڈر لکھتے ہیں کہ کتاب کی غلطیاں اتنی ہیں کہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح کون ہے۔؟ ہارن اپنی تفسیر کی دوسری جلد میں لکھتا ہے کہ بلاشبہ بعض تحریفات جان بوجھ کر لوگوں نے کی ہیں۔ ڈاکٹر ولیتق کے نزدیک انجیل متی کا پہلا اور دوسرا باب الحاقی ہے۔ لوقا کے نام سے جو انجیل ہے اس کے بارہ میں آج تک کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کون تھا۔؟ انجیل یوحنا کے بارہ میں عیسائی اہل تحقیق کی رائے ہے کہ اسے مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے تصنیف کیا ہے۔[3]

---

[1] النبی الخاتم ص۲۱ [2] اختتام مباحثہ دینی مطبوعہ حیدر آباد [3] اسلام کی عالمگیری اور جامعیت ماہنامہ الحق جون ۱۹۶۶ء

دیگر مذاہب اور تعمیرِ اخلاق

ان دو عظیم مذاہب کے علاوہ دنیا میں بدھ مت، ہندو مت یا برہمنیت، کنفیوشس، تاؤ مت، شنتو مت وغیرہ کے نام سے جتنے مذاہب کے سراغ مل سکتے ہیں وہ ایک تو اپنے پیروؤں کے ہاتھوں اس قدر مسخ ہو چکے ہیں کہ اگر ان مذاہب کے پیشوا بھی کسی طرح دنیا میں آجائیں تو انہیں نہ پہچان سکیں پھر ان میں سے اکثر مذاہب کا تعلق ایک قومی، علاقائی یا کسی خاص طبقہ اور قبیلہ سے تھا۔ عالمگیر انسانیت کی تعمیر اور ہدایت سے نہیں ——— ہندو مت عالمگیر تو کیا اپنے ملک اور قوم کو بھی یکساں حیثیت نہیں دیتا کنفیوشس مت، چین اور شنتو مت جاپان کی اکثریت کا مذہب رہا اور بدھ مت چین جاپان اور ہندوستان کے بعض علاقوں کے مذہب بنے اور اکثر عقائد کی بربادی اخلاق کی تباہی اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق کا شکار ہو گئے۔ یہاں ہم برہمنیت اور بدھ مذہب پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہیں جس کا برصغیر اور چین کے علاقوں پر اثر رہا ——— بدھ مذہب کے بانی گوتم بدھ کی تعلیمات میں اخلاقیات رحمدلی، شفقت اور سادگی پائی جاتی تھی۔ مگر ایک تو احسان دعفو کے ساتھ اس میں بھی عدل اور قانون اور دین کے ساتھ دنیا کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ دوسرے بہت جلد ہندوستان کے برہمنی مذہب کو اپنے ساتھ شامل کرکے اس نے بھی مسیحیت کی طرح اپنی انفرادیت کھو دی اور گوتم کی اخلاقی تعلیمات نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ اس نے بھی برہمنیت کی طرح گوتم کو اوتار بنایا اور عقیدہ توحید کو تجسم اور حلول اور مظاہر پرستی کے ذریعہ سے فنا کر دیا۔ وہ سور، کچھوے، گائے، شیر اور سانپ تک کی پوجا کرنے لگے اور اس عقیدہ کی بنا پر راجہ چندر اور کرشن جی کو اوتار تسلیم کیا جانے لگا[1] بدھ مت کے پیروؤں کی پوری مذہبی اور تمدنی زندگی پر بت پرستی اور گوتم کے مجسمے چھا گئے۔ پنڈت نہرو اپنی کتاب تلاش ہند میں لکھتے ہیں کہ بدھ رہنما نہایت دولت مند اور ایک طبقہ کے مفاد کے مرکز بن گئے۔ عبادت میں سحر اوہام داخل ہو گئے ——— یہاں تک کہ رائس ڈیوڈس کے الفاظ میں ساری فضا پر ذہن کے ان پرفریب نظریات کی گھٹا چھا گئی اور بانی مذہب کی سادہ تعلیمات ان آلبیاتی موشگافیوں میں دب کر رہ گئے۔[2]

برہمنیت اور بدھ مت کی ان مسخ شدہ تعلیمات کے نتیجہ میں ہندوستان جس مذہبی اور اجتماعی خرابیوں میں مبتلا ہوا اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان کی مذہبی کتب وید وغیرہ دیوتاؤں کے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہیں جس کے نتیجہ میں ہر شخص نے مہیشر، وشنو، سورج چاند

۱؎ تفسیر حقانی جلد دوم ص ۲۳ ۲؎ تلاش ہند ص ۲۰۱ ص ۲۰۳ از مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

ستاروں یہاں تک کہ گائے کے گوبر تک کو اپنا معبود بنالیا۔ قوت علمیہ کی اس بربادی کے ساتھ ان مذاہب کی کتابیں اخلاق و اعمال کی بجائے جنسی اور شہوانی جذبات ابھارنے والے کوک شاستر بن کر رہ گئی ہیں۔ ان میں دیویوں اور دیوتاؤں کے باہمی اختلاط کے ایسے افسانے پائے جاتے ہیں جنہیں سن کر مارے شرم کے پیشانی عرق آلود ہو جائے۔ اخلاقی گراوٹ کی انتہا یہ ہے کہ ان مذاہب میں بڑے دیوتا (شیو) کے آلۂ تناسل (لنگم) کی پوجا ہوتی ہے۔ اور بچے جوان مرد و عورت سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر گستاؤلی بان ان مذاہب پر حیوانی شہوت کے تسلط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں جن میں سب سے مقدم لنگم اور یونی ہیں۔ (جن سے مراد مرد اور عورت کی شرمگاہیں ہیں) اشوک کے ستونوں کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں۔ اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک لنگم کی مشابہت کی وجہ سے واجب التعظیم ہیں[1]۔ ستیارتھ پرکاش میں لکھا ہے کہ ایک مذہبی فرقہ کے برہنہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے کی شرمگاہوں کی عبادت کرتے ہیں[2]۔ برہمنی تہذیب میں شوہر خاندان یا اس کے بھائیوں سے مشترکہ طور پر اولاد پیدا کرنے کا رواج قدیم ہندوستان کا ایک جانا پہچانا رواج ہے۔ ستیارتھ پرکاش میں مختلف مقامات پر "نیوگ" کے نام سے اس شرمناک رسم کا ذکر موجود ہے[3]۔ اپنے رہنما کرشن جی کے بارہ میں بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ وہ نہاتی ہوئی گوپیوں کے کپڑے اٹھا کرلے جاتا اور ان دوشیزاؤں کو چھیڑا کرتا تھا۔ اپنے اس مہاراج کے بارہ میں ان لوگوں کی تصریحات ہیں کہ ان کے پاس سولہ ہزار ایک سو آٹھ باندیاں اور آٹھ مہارانیاں تھیں[4]۔

یہ تو صرف اخلاقی پہلو تھا۔ ان مذاہب کی غیر معتدلانہ تعلیمات کی وجہ سے ان کے پیرو جس شدید ترین طبقاتی تفریق میں مبتلا ہوئے اور انسان کی انسانیت کو جس بے دردی سے ذلیل اور مجروح کیا گیا، تاریخ عالم میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ برہمنی تہذیب کیلئے مذہبی دستاویز منوشاستر بنانے والے منوجی نے شودر کی پیدائش کا مقصد صرف برہمنوں کی خدمت گذاری قرار دیا ہے۔ اس نے برہمن کو تمام اخلاقی حدود سے آزاد رکھ کر اسے بلا روک ٹوک غلام شودر کا مال اور عصمت لوٹنے کی اجازت دی ہے۔ اگر وہ برہمنوں پر ہاتھ اٹھائے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ اور اگر ان کے ساتھ یکجا بیٹھنے کی جرأت کرے تو اس کی سرین کو داغوا دیا جائے۔ ـــــ

---

[1] تمدن ہند ص۴۴۷ [2] ستیارتھ پرکاش ص۱۵۲ [3] ستیارتھ پرکاش ص۱۵۳ [4] رحمۃ اللعالمین جلد ۳ ص۲۷۹

شودر کو مال و دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں اگر کوئی شودر مذہبی کتابیں پڑھنے کی جرأت کرے یا برہمن کو سخت بات کہے تو اسکی زبان کھینچ لی جائے اور اگر وید کا کوئی منتر سننے کی کوشش کرے تو اس کے کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈال دیا جائے۔ اس مذہبی دستاویز میں ہے کہ کتے، بلی اور شودر کے قتل کا کفارہ برابر ہے[۱]۔ برہمن تہذیب میں عورت کو ایک ذلیل حقیر اور کمزور مخلوق کی حیثیت دی گئی ہے۔ اسکی عفت و عصمت کی قدر کا اندازہ نیوگ اور مشترکہ بیوی کے رواج سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسے شوہر کے ساتھ ستی ہونے یا جیتے جی دوسری شادی نہ کرنے کی تعلیم دی گئی —

برہمنیت کے متبعین میں سے بعض لوگوں نے مختلف ریاضتوں اور جوگیت وغیرہ کے ذریعہ اپنی اصلاح کرنی چاہی مگر اس کا حشر بھی رہبانیت کی طرح بھیانک رہا جن لوگوں کی نگاہ میں صرف وسط ایشیا کے ان قدیم مذاہب کی یہ سیاہ تصویر ہے اور وہ اسلام کے ہمہ گیر جامع اخلاقی نظام سے واقفیت نہیں رکھتے وہ موجودہ عیسائی دنیا کی طرح اخلاقی اقدار میں مذہب کی تعمیری صلاحیتوں کے قائل نہ رہ سکے —

ہندوستان کے برہمن نژاد اور مشہور رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کے ایک سیاسی سوانح نگار پروفیسر سائیکل بریچر نے ان سے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک ایک اچھے کام کے لئے کیا چیزیں ضروری ہیں۔؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "میں کچھ معیاروں کا قائل ہوں آپ ان کو اخلاقی معیار کہہ لیجئے یہ معیار ہر فرد اور سماج کیلئے ضروری ہیں مگر ان معیاروں کو قائم رکھنے کیلئے مذہبی نقطۂ نظر اپنی تمام رسوم اور طریقوں کے ساتھ مجھے تنگ نظر آتا ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے اخلاقی قدروں کو مذہب سے علیحدہ رکھنے پر زور دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ مذہب سے علیحدہ اخلاقی قدروں کو ماڈرن زندگی میں کس طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک مسئلہ ہے"

ہندوستان کے ان مذاہب کے متوازی اسلام سے قبل جو تحریکیں اور تہذیبیں اٹھیں انکی اخلاقی حیثیت کا بھی یہی حال ہے۔ ایرانیوں کے ہاں ازدواجی رشتہ کیلئے حلال و حرام کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ پانچویں صدی کے یزدگرد نے اپنی لڑکی اور بہرام (چھٹی صدی عیسوی) نے اپنی بہن کو زوجیت میں رکھا۔ تیسری صدی عیسوی میں اس شدید اخلاقی بحران کے ردعمل میں مانویت کے نام سے ایک اصلاحی تحریک اٹھی، جو سراسر غیر فطری اور غیر اخلاقی تھی اس میں تجرد کی زندگی کو لازم اور نکاح کو حرام

---

[۱] منو شاستر کے مختلف ابواب۔

قرار دیا گیا۔ تاکہ نوع انسانی جلد سے جلد فنا ہو اور دنیا اخلاقی رذائل اور برائیوں سے پاک ہو سکے۔ مانی کی دشمن فطرت تعلیمات کے ردعمل میں مزدکیت کی تحریک اٹھی جس نے اخلاق کی تمام حدود توڑ دیں اور دیگر اشیاء کے علاوہ عورت کو بھی ہر ایک کیلئے حلال ٹھہرایا۔ اس کے نتیجہ میں پورا ملک بے حد انارکی، شہوت پرستی، لوٹ کھسوٹ اور حیوانیت میں ڈوب گیا، جو چاہتا کسی کے گھر میں گھس آتا اور مال و زن پر قبضہ کر لیتا۔ آج کی مغربی تہذیب عورت کے معاملہ میں اور اشتراکیت مال و دولت کے معاملہ میں انہی مزدک کے طریقوں پر عمل پیرا ہے۔ ایران کے ان قدیم مذاہب میں بادشاہ کے ساتھ طبقہ واریت کا وہی معاملہ ہوا جو برہمنیت میں تھا۔ بادشاہوں کی عبادت کی جاتی اور انہیں تمام اخلاقی تقاضوں سے آزاد سمجھا جاتا اور اس کے ساتھ اہل ایران اپنے آپ کو دنیا کی ہر قوم اور نسل پر برتر سمجھنے لگے۔ ان دونوں مجوسیت کے نام سے جو تحریک اٹھی، اسکی بھی عقائد و اخلاق کے سلسلہ میں یہی حالت ہے ———

(باقی آئندہ)

بقیہ ۴۴ سے آگے

وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر فرمائی تھی۔ اب یہ پتھر ایک آہنی جالیدار کمرہ میں محصور ہے۔ حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ سے دوران درس میں یہ بات ہم نے سنی تھی۔ "کہ پہلی بار جب میں حج کیلئے گیا تو "مقام" والے پتھر کو میں نے دیکھا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مبارک قدموں کا نشان تھا۔ میں نے اس میں زمزم کا پانی ڈال کر پیا تھا"

سننے میں آیا ہے کہ "مطاف" کو وسیع کرنے کے منصوبہ میں اس پتھر کو بلوری شیشہ کے اندر رکھ کر اوپر کی عمارت کو ہٹا دیا جائے گا۔ ان آہنی جالیوں میں بعض سادہ لوح زائرین نے اللہ تعالیٰ کے نام خطوط لکھ کر ڈالدئے ہیں۔ بعض نے اشرفیاں، ریال، سونے، چاندی کے زیورات، اور بعض نے تو اپنے فوٹو بھی یہاں ڈال دئے ہیں۔

(باقی آئندہ)

مولانا شیر علی شاہ صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ

گذشتہ سے پیوستہ

مکہ مکرمہ کے مقدس شہر کی آبادی پر نظر پڑتے ہی یہ دعا وردِ زبان ہوئی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ لِیْ بِھَا قَرَاراً وَّارْزُقْنِیْ فِیْھَا رِزْقاً حَلَالاً۔ اے خدا! مجھے اس شہر میں سکون اور رزقِ حلال عطا فرما۔

تھوڑی دیر بعد مسجد الحرام کے پیارے بلند و بالا مینار نظر آئے۔ بے تابانہ نگاہیں میناروں کی طرف اٹھیں آنکھوں کے سامنے پُرشکوہ بابرکت مینار اور کانوں سے مسجد الحرام کے میناروں سے عصر کی پیاری اذان سن رہے ہیں ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

کنڈیکٹر نے بس کا دروازہ بند کیا ہوا ہے۔ کسی کو اترنے کی اجازت نہیں ہے۔ بسوں، کاروں اور پیدل چلنے والوں کے بے پناہ ہجوم کے باعث ہماری بس نے چند فرلانگ کی مسافت دو گھنٹے میں طے کی۔ محلہ جیاد میں اتر کر "سراج قصاص" معلم کے مکان میں اپنا سامان رکھ دیا۔ وضوء کر کے مسجد الحرام روانہ ہوئے ـــ یہ جنت کی زمین، فرشتوں کا شہر، معطر نورانی فضا، روح پرور اور ایمان افزا ماحول، وحیٔ الٰہی کا جائے نزول، رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد و مسکن، مسلمانانِ عالم کا قبلہ، اُمّ القریٰ، بکہ، مکہ، عروس البلاد، مذہبِ اسلام کی عظمت و شوکت کی عظیم الشان یادگار، حضرت

ابراہیم واسماعیل علیہما الصلوات والتسلیمات کی فرودگاہ ، اور ہم جیسے سیہ کاروں کی حاضری اور ورود، قدم فرطِ محبت سے لرز رہے ہیں اور دل وفورِ شوق سے امنڈ رہا ہے۔ کسی نے کہا وہ سامنے کعبۃ اللہ ہے ــــــ

اَللّٰھُمَّ زِدْ بَیْتَکَ ھٰذَا تَشْرِیْفًا خداوندا ! اس مقدس گھر کی شرافت وکرامت ،
وَّ تَکْرِیْمًا وَّ تَعْظِیْمًا وَّ مَھَابَۃً وَّ رِفْعَۃً تعظیم وجلال میں اضافہ فرما۔
وَ بِرًّا ۔ ...

ے کعبہ سنتے ہیں کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض زندگی ہے تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا

اللہ اکبر ، یہ لحظہ طیبہ زندگی کے تمام لمحات وساعات میں کتنا مبارک اور باسعادت ہے ، جس میں کئی سالوں کی طویل ومدید اشتیاق وتمنا کے بعد بیت اللہ الجلیل کے انوار وتجلیات . اشکبار آنکھوں کی نگاہیں پڑیں۔ روح بے پناہ خوشی سے جھوم رہی ہے ۔ ے

نازم بچشم خویش کہ جمالِ تو دیدہ است افتم بہ پائے خویش کہ بکویت رسیدہ است

جمال وجلالِ کعبہ نے سفر کی تمام تھکاوٹوں کو راحت وسرور میں تبدیل کر دیا۔ قدرت کے کرشمے ہیں ۔ جس جگہ کی آستان بوسی شہنشاہانِ جہاں اور تاجدارانِ دنیا ہر دور اور ہر زمانہ میں اپنے لئے باعثِ سرفرازی وسعادت سمجھتے رہے ہیں . ہم جیسے فقیروں کو بھی اس مقدس گھر کے در تک رسائی نصیب ہوئی ــــــ ے

جذبِ دل نے آج کوئے یار میں پہنچا دیا جیتے جی میں گلشنِ جنت میں داخل ہوگیا
ے ڈھونڈتے ڈھونڈتے جا پہنچے ہم اس گھر کے تلک
دلِ گم گشتہ میرے حق میں تو رہبر نکلا !

اللہ اللہ ! یہ آنکھیں بھی اس قابل ہوئیں کہ جمالِ کعبہ کی دید سے شرف اندوز ہو رہی ہیں۔ ابھی ہم نئے تعمیر شدہ برآمدوں میں سے بیت اللہ شریف کی طرف جا رہے تھے کہ نمازِ عشاء کے لئے اقامت شروع ہوگئی۔ یہ ہماری اولین نماز ہے کہ عین قبلہ ہمارے سامنے ہے جس قبلہ کی طرف دن میں پانچوں وقت ہزاروں میل دور سے رُخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ آج اسی کے سامنے کھڑے ہیں ــ

حضرت عمرؓ ایک دفعہ خانہ کعبہ کی آغوش میں نماز پڑھاتے وقت لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ کی سورت تلاوت فرما رہے تھے۔ فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ ھٰذَا الْبَیْتِ پڑھتے ہوئے بے اختیار اس مبارک گھر کی طرف انگلی سے اشارہ فرما گئے ــــــ۔

نماز سے فراغت کے بعد دوگانہ تشکر ادا کیا ؎

بے خودی شوق کی اور عرض تمنا اُن سے
نہیں معلوم کہ منہ سے میرے کیا کیا نکلا

؎ نالہ کر لینے دیں للہ نہ چھیڑیں احباب ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

یا اکرم الاکرمین ۔ یا رب البیت العتیق ۔ اپنے گھر سے تمہارے اس سراپا یمن و برکت مقدس گھر تک کتنے حجاب اور موانع کے طبقات تھے ، جو رفتہ رفتہ رفع ہوتے رہے ہیں ۔ دوری کے وہ حجابات ختم ہو گئے ہیں ۔ اب تو خانہ کعبہ سامنے ہے ۔ یہ باب السلام ہے ، اور یہ چاہ زمزم ، سامنے مقام ابراہیمؑ اور بیت اللہ الجلیل ، جس کے ارد گرد سفید پوش حجاج کرام طواف کر رہے ہیں ۔ اور اس کے کونہ میں یہ ہجوم حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے جمع ہے ۔

حضرت الشیخ حافظ الحدیث درخواستی صاحب مدظلہ کی بات یاد آئی ۔ " قدم ہوں مسجد حرام میں اور نگاہیں خانہ کعبہ پر تمام الجھنیں دور ہو جاتی ہیں ۔ اور قدم ہوں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ، نگاہیں گنبد خضراء پر روایات و احادیث کے اشکالات رفع ہو جاتی ہیں ۔"

ساتھی نے کہا باب السلام (باب بنی شیبہ) کی طرف سے آکر حجر اسود کو بوسہ دینے سے طواف شروع کریں گے ۔ تلبیہ پڑھتے جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو ۔ کیونکہ زائر حرم کی دعا (جب اسکی اولین نگاہیں خانہ کعبہ پر پڑ رہی ہوں) مقبول و مستجاب ہے ۔"

باب السلام سے داخل ہوتے وقت مسنون دعا بِسْمِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ پڑھتے ہوئے آگے بڑھے ، اسی اثنا میں وہ دعائیں پڑھنی چاہئیں جو رسائل حج میں درج ہیں ۔ الحمد للہ کہ "حجر اسود" کا بوسہ بآسانی نصیب ہوا ۔ یہاں کسی کو دھکیلنے کی اجازت نہیں ۔ ہمارے ہونٹوں کی بلند بختی کا کیا کہنا کہ "حجر اسود" کی تقبیل سے لطف اندوز ہوئے ۔

حجر اسود "حجر" کے معنی پتھر اور "اسود" کے معنی ہیں کالا ۔ اس کالے پتھر کا رنگ عقیق سیاہ کی طرح ہے ۔ اس کا مکمل دور دو فٹ یا کم و بیش ہے ۔ یہ پتھر بیت اللہ کے جانب مشرق و جنوب کے گوشہ میں باہر کی طرف دیوار میں ایک گز کی بلندی پر جڑا ہوا ہے ۔ اس کے متفرق ٹکڑوں کو چاندی کے خول میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے کہتے ہیں کہ یہ چاندی کا خول عبد اللہ ابن زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے ہاتھوں کا لگا ہوا ہے جبکہ ۶۴ھ میں حصین ابن نمیر نے یزید بن معاویہ کے حکم پر مکہ معظمہ پر فوج کشی کی اور "ابی قبیس" پہاڑی پر مجانیق نصب کر کے پتھر برسائے تو

منجنیق سنگ باری سے حجر اسود کئی ٹکڑے ہوگیا۔ ابن زبیرؓ نے ان ٹکڑوں کو چاندی کے حلقہ میں جمع کر دیا۔ یہ پتھر حضرت "ابراہیم" علیہ السلام کے مبارک ہاتھوں کا نصب شدہ ہے۔ اس لئے متبرک ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بوسہ دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ ائمہ مجتہدین ومفسرین اور ہر قرن کے اولیاء اللہ اور صلحائے امت نے اسکو بوسہ دیا ہے۔ اور قیامت تک زائرین حرم اسے بوسہ دیتے رہیں گے، کتنی خوش بختی اور بلند اقبالی ہے۔ کہ انبیاء کرامؑ اور صحابہ وتابعین کی بوسہ گاہ کو بوسہ دیا جائے جو درحقیقت ان کے مطہر ومقدس ہونٹوں کو بوسہ دینے کے مترادف ہے۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا نَزَلَ مِنَ السَّمَاءِ الْحَجَرُ الْاَسْوَدُ۔ کَانَ اَبْیَضَ مِنَ اللَّبَنِ سَوَّدَتْہُ خَطَایَا بَنِیْ آدَمَ۔	حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "حجر اسود" دودھ سے زیادہ سفید تھا جبکہ اسے آسمان سے اتارا گیا تھا۔ بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر ڈالا۔
عَنْ اِبْنِ عُمَرَؓ اَنَّ الْحَجَرَ الْاَسْوَدَ وَالْمَقَامَ الْاِبْرَاھِیْمِیَ یَاقُوْتَتَانِ مِنَ الْجَنَّۃِ۔	ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ "حجر اسود" اور "مقام ابراہیمؑ" دونوں جنتی یاقوت ہیں۔

....

قاضی عیاض فرماتے ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ مَنْ دَعَا عِنْدَ الْحَجَرِ الْاَسْوَدِ اِسْتَجَابَ اللّٰہُ دُعَاءَہٗ۔	حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص بھی حجر اسود کے آغوش میں اللہ تعالیٰ سے مانگے گا۔ اللہ تعالیٰ اسکی دعاؤں کو قبول فرمائیگا

یہ بھی منقول ہے کہ یہ پتھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا دست راست ہے۔ اپنے بندوں سے اسکی وساطت مصافحہ فرماتے ہیں ــــ حضرت عمرؓ نے اس پتھر کو بوسہ دیتے وقت فرمایا تھا:

وَاللّٰہِ اِنِّیْ اَعْلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ لَا تَنْفَعُ وَلَا تَضُرُّ۔ لَوْلَمْ یُقَبِّلْکَ النَّبِیُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) لَمَا قَبَّلْتُکَ	خدا کی قسم مجھے یقین ہے کہ آپ ایک سیاہ پتھر ہیں۔ نہ کسی کو نفع دے سکتے ہیں نہ نقصان اگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کا بوسہ نہ لیتے تو آج میں آپ کا بوسہ نہ لیتا۔

"اِتْحَافُ السَّعَادَۃِ" میں حضرت علیؓ سے منقول ہے۔ اِنَّہٗ یَنْفَعُ وَیَضُرُّ۔ کہ یہ پتھر نفع ونقصان

ذریعہ ہے۔ درحقیقت حضرت عمرؓ نے مشرکین عرب کے غلط عقائد کی اصلاح کے باعث، فرمایا تھا کہ یہ پتھر اس لئے نہیں چوما جاتا کہ یہ بذات خود کسی کو نفع پہنچانے والا یا نقصان دہ ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی مطلوب ہے۔ اور حضرت علیؓ کے فرمان کا یہ مقصد ہے کہ اسکو بوسہ دینے اور اس کے پاس دعا کرنے سے رب البیت برکات، وعنایات نازل فرماتے ہیں۔

شیخ طرسوس رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ اس پتھر کی یہ خاصیت ہے کہ آگ کی حرارت اس پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ اسکو اگر کئی دن آگ میں رکھا جائے یہ ٹھنڈا رہے گا۔ اور اگر اسکو پانی میں ڈالیں تو لکڑی کی طرح پانی کی سطح پر تیرتا رہے گا۔ اور کبھی نہیں ڈوبے گا۔

عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْحَجَرِ وَاللّٰهِ لَيَبْعَثَنَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهُ عَيْنَانِ يُبْصِرُ بِهِمَا وَلِسَانٌ يَنْطِقُ بِهٖ يَشْهَدُ عَلٰى مَنْ اِسْتَلَمَهٗ بِحَقٍّ (رواہ الترمذی)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پتھر کے بارے میں فرمایا۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ اس پتھر کو قیامت کے دن اٹھائے گا جبکہ اسکی دو آنکھیں ہوں گی جن سے یہ دیکھے گا اور زبان ہوگی جس کے ذریعہ ان خوش قسمت لوگوں کے بارے میں گواہی دے گا جنہوں نے خلوص وصداقت سے اسکے بوسے لئے ہیں۔

طواف حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر طواف کی نیت کے بعد دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھا کر بسم اللہ اللہ اکبر وللہ الحمد پڑھ کر اسکو بوسہ دینے کے لئے آگے بڑھیں اگر بوسہ ممکن نہ ہو تو دونوں ہاتھ حجر اسود پر رکھ کر ہاتھوں کو چوم لینا چاہیئے۔ اگر دونوں ہاتھوں کا رکھنا مشکل ہو تو صرف دائیں ہاتھ رکھ دیں۔ اور اگر ہجوم زیادہ ہو تو پھر کسی کو دھکیلنے کی ضرورت نہیں دور سے اشارہ کر کے اپنے ہاتھوں کو چوم لینا چاہیئے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مطاف میں اتنا ہجوم نہیں۔ اکثر حاجی منی کو چلے گئے ہیں۔ کل عرفہ کا دن ہے۔ ہمیں ہر شوط میں حجر اسود کا بوسہ نصیب ہوتا ہے۔ ہم جیسے دیر سے پہنچنے والوں کی قلیل تعداد رہ گئی ہے۔

مناسک حج کی کتابوں میں ہر شوط کی علیحدہ دعائیں درج ہیں۔ اگر کتاب سے دعائیں پڑھیں یا یاد سے دونوں بہتر ہیں اور اگر قرآن مجید کی کچھ سورتیں یاد ہیں تو انکی تلاوت بھی افضل ہے مگر دعائیں یاد نہیں تو رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ کی دعا پڑھیں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ پڑھیں ــــ امام زین العابدینؒ جب

آدھی رات کے وقت یہاں پہنچے تھے تو انہوں نے طواف کرتے ہوئے یہ دعائیہ اشعار پڑھے تھے۔

يَا مَنْ يُجِيبُ دُعَا الْمُضْطَرِّ فِي الظُّلَمِ ۔۔۔ يَا كَاشِفَ الضُّرِّ وَالْبَلْوٰى مَعَ السَّقَمِ

اے میرے مولا جو تاریکیوں میں پریشان حال کی دعائیں قبول فرماتا ہے۔ اور ہر تکلیف، مصیبت اور بیماریوں کو دور فرماتا ہے۔

قَدْ نَامَ وَفْدُكَ حَوْلَ الْبَيْتِ وَانْتَبَهُوا ۔۔۔ وَعَيْنُ جُودِكَ يَا مَوْلَايَ لَمْ تَنَمِ

آپ کے مہمان خانہ کعبہ کے اردگرد سوئے ہوئے ہیں اور کچھ بیدار ہیں۔ مگر اے مولا آپ کی چشم سخا کبھی نہیں سوتی۔

إِنْ كَانَ عَفْوُكَ لَا يَرْجُوهُ ذُو خَطَأٍ ۔۔۔ فَمَنْ يَجُودُ عَلَى الْعَاصِينَ بِالنِّعَمِ

اگر تیرے بخشش و کرم کی امید خطاوار نہ رکھیں، بھلا کون گنہگاروں کو نعمت و درگزر سے نوازے گا۔

هَبْ لِي بِجُودِكَ فَضْلَ الْعَفْوِ عَنْ زَلَلِي ۔۔۔ يَا مَنْ إِلَيْهِ رَجَاءُ الْخَلْقِ فِي الْحَرَمِ

اپنے جود و کرم سے میرے گناہوں اور لغزشوں کو معاف فرما۔ تمام مخلوق کی امیدیں تیرے حرم پاک سے وابستہ ہیں۔

(بعض اکابر نے یہ اشعار شیخ اکبر ابن عربیؒ کیطرف منسوب کئے ہیں)

حطیم رکن یمانی پہلے تین چکروں میں "رمل" (مونڈوں کو ہلاتے ہوئے تیز قدم چلنے کو رمل کہتے ہیں۔) باقی چار چکروں میں اپنی چال چلنا چاہئے۔ "حطیم" دیکھا۔ "رکن یمانی" کا استلام نصیب ہوا۔ احرام کے کپڑے اور جسم کے ظاہری اعضاء "ملتزم" کے التزام سے مسعود و محظوظ ہوئے۔ "باب الکعبۃ" (کعبہ کا دروازہ) اور "حجر اسود" کے درمیان جگہ کو ملتزم کہتے ہیں۔ یہاں انتہائی تواضع و انکساری کے ساتھ رب البیت سے اپنے لئے اور اپنے والدین و اقارب۔ اساتذہ و مشائخ۔ غرض تمام متعلقین و جملہ اہل اسلام کیلئے دعائیں مانگنی چاہئیں۔ ع۔ وَمَنْ دَقَّ بَابَ كَرِيمٍ فُتِحْ۔ جو سخی کے دروازے کو کھٹکھٹائے گا وہ مقصود پاکر جائیگا۔ اکرم الاکرمین کے بارگاہ قدس میں لجاجت و انتہائی عاجزی کے ساتھ جو دعا بھی مانگیں اسے شرف قبولیت نصیب ہوگی۔

مقام ابراہیم ملتزم کے پاس دعا کرکے "مقام ابراہیم" میں دو رکعت پڑھ لیں۔ مقام ابراہیم

باقی ص۵۵ پر